دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۸ ماہ ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۱۱ء عدد ۵

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

یہ صحیح ہے کہ عالم شوق و انتظار میں یادوں کی سبحہ خوانی کے لیے ماہ و سال کی شرط وجہ جواز نہیں، تاہم جب جب نومبر کا مہینہ آتا ہے تو اس داستان کو سننے سنانے کا شوق تیز تر ہو جاتا ہے جو خود صاحب داستان کے لفظوں میں حدیث عشق ہے جو خود بھی دلکش ہے اور صاحب داستان نے اس کو اور بھی خوش تر کر دیا

حدیث عشق خوش بود است و شبلؔی خوشترک کرد است
شنیدن می تواں زیں حرف رنگیں داستانے را

''حیات شبلی'' سے ''شبلی کی معنویت'' تک قریب ایک صدی سے یہ داستان سنائی جاتی رہی ہے لیکن ہر داستان گو کے دل میں یہی حسرت رہی کہ '' آہ بہت کچھ کہنا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے سینوں میں جو کچھ وسعت ہے وہ کاغذ کے صفحوں میں نہیں'' اس حسرت کی واقعیت سے انکار بھی اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ جس ہستی نے ایک نہایت پرآشوب دور میں رازی و غزالی کے افکار سے سیرابی حاصل کی، شیراز کے نغمہ سراؤں سے ہم آواز رہا، حجازی آہنگ کے اسرار کا راز داں بھی رہا، جو ایسا گوہر فروزاں تھا کہ ہر بزم میں اس کا نور جلوہ ساماں رہا، جس کی نگاہ میں صد حرف راز نہاں رہے، ایسی ہستی کے بیاں کے لیے یقیناً کچھ اور وسعت چاہیے۔

ایک گفتگو میں خیال آیا کہ یہ نومبر ۲۰۱۱ء ہے، دیکھا جائے کہ ٹھیک سو سال پہلے یعنی ۱۹۱۱ء میں اس ہستی کے شب و روز میں کن رنگوں کا عکس جھلکتا تھا، وہ جو صرف دماغ ہی نہ تھا، ہاتھ بھی تھا، قومی تحریکوں کے عواقب پر جہاں اس کی نظر پہنچی، حریف اس کے دیکھنے سے بھی قاصر تھے بلکہ جن دینی و ملی کارناموں کا تماشا وہ دیکھنا اور دکھانا چاہتا تھا، اکثر آنکھیں اس کے دیکھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھیں، بظاہر یہ الفاظ، غلو اور فرط عقیدت کے غماز ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ مذہبی، قومی، تعلیمی، اجتماعی، سیاسی، ادبی غرض عمل کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں علامہ شبلی کے نقش کی تابانی نہ ہو، اس اجمال کی تفصیل کے لیے شبلیات کا موجودہ ذخیرہ کم نہیں، یہاں صرف ۱۹۱۱ء میں ان کے طائر عزم کی پرواز کی بلندیوں کو دیکھا جائے کہ وقت موعود سے صرف تین سال پہلے

جب علامہ شبلی، مصائب و مسائل کے ہجوم میں اپنی صحت اور قوت جسمانی کھو چکے تھے، آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا، موتیا بند کی تکلیف سے ان کو رنج اس کا تھا کہ ''سپاہی سے ہتھیار چھین لیا جائے تو وہ کیا لڑے گا، جب وہ لکھنے پڑھنے کا کام نہ کرسکیں تو پھر ایسی زندگی سے کیا حاصل''، شکستگی دل، دیدنی تھی لیکن ایسے عالم میں بھی ندوہ کے حالات کو درست کرنے میں اپنے حبیب مولانا شروانی اور مولانا آزاد سے مسلسل مشوروں کا عمل جاری تھا، علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی کوششوں میں بھی اسی درجہ انہماک تھا یہ کس انداز پر ہوگی، مولانا نے یہ علی گڑھ والوں کی خواہش پر چھوڑا ان کی تمنا اور کوشش صرف یہ تھی کہ یہ کالج بہرحال یونیورسٹی ہو جائے، وقف علی الاولاد کا قضیہ، اس وقت مسلمانوں کے پرسنل لا کا سب سے اہم مسئلہ تھا، روز و شب اس کے مسودات کی تیاری اور انگریزی ترجمے کے لیے وقف تھے کہ یہ جلد سے جلد وائسرائے اور کونسل کی نظر سے گزرے، شعرالعجم کا چوتھا حصہ بھی تیار کر کے مطبع بھیج دیا اور اب ساری توجہ سیرت النبیؐ کی تالیف کی تیاری پر تھی، مستشرقین کی تحریروں کو جمع کرنا شروع کیا، شملہ میں علوم مشرقی کی کانفرنس میں شامل ہوکر ندوے کو روشناس کرایا، جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلامی کی زہرناکی خطرناک ہو چلی تھی، اس کی دروغ بیانیوں کا رد لکھا، اردو ہندی کی کشمکش کو حکومت ہوا دے رہی تھی، اردو کی حمایت کے لیے ایک کمیٹی بنائی، الہ آباد یونیورسٹی میں اردو نصاب کے جلسہ میں شرکت ضروری تھی کہ یہاں بھی اردو کو مٹانے کی تیاریاں تھیں، یہ صرف اس سال کے اہم کاموں کے عناوین ہیں، مولانا خرابی صحت کے باوجود شملہ سے بمبئی تک منزلیں طے کرتے رہے، آج نومبر ۲۰۱۱ء میں اگر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ علامہ شبلی کا یہ ایک سال ہمارے کتنے برسوں پر حاوی ہے تو کیا ہمارے پاس کوئی جواب ہے؟ کم از کم یہ ادراک تو حاصل ہو کہ

دل نہ تھا پہلو میں اس کے پارۂ سیماب تھا
یا سراپا زخم خوردہ درد کی تلوار تھا

یہ عجیب اتفاق ہے کہ نومبر کا یہی مہینہ ہے جس میں علامہ شبلی کے سب سے مکمل جانشین مولانا سید سلیمان ندوی اور سید صاحب کے لائق شاگرد جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن بھی اس دنیا سے رخصت ہوئے، شبلی کے آسمان علم و عمل کے یہ سیارے جس طرح اپنے آفتاب کی کرنوں کو

دارالمصنّفین کے برج سے ایک عالم کو روشن کرتے رہے ان کی ایک ایک کرن کو پانے کی ضرورت آج بھی ہے، دسمبر میں دارالمصنّفین میں یادشبلی کی ایک مجلس آراستہ ہونے کو ہے، اس سے اس ضرورت کے پورا ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

دارالمصنّفین نے ہمیشہ دینی و علمی کاوشوں کی قدر کی، ۲۸ء میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے حدیث شریف کا ایک مجموعہ جمع الفوائد کے نام سے شائع کیا، اس مجموعہ میں چودہ کتب حدیث کی روایتوں کو یکجا کیا گیا تھا، مولانا میرٹھی اس مجموعہ کو اپنی محنت و سرمایہ سے شام جا کر لائے، بیروت میں ٹائپ کرایا اور میرٹھ سے شائع کیا، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس شرف کو ہندوستان کے لیے ایک نئے شرف سے تعبیر کیا اور اپنے مخصوص طرز سلیمانی میں لکھا کہ ''ہندوستان ہزار بدقسمت سہی مگر کم از کم اس کی ایک خوش نصیبی کا تو سب کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہی وہ ملک ہے جس نے ترجمہ قرآن مجید اور احادیث کی اشاعت میں تمام ممالک اسلامیہ میں سب سے زیادہ خدمات انجام دی ہیں''، آج قریب تین چوتھائی صدی گزرنے کے بعد یہی الفاظ، فاضل جلیل مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی کے لیے مستعار لیے جاسکتے ہیں، جنہوں نے ایک عمر، علم حدیث کی خدمت میں یوں گزاری کہ موطا امام مالک اور سنن ابی داؤد کی شرحوں کو اوجز المسالک، بذل المجہود اور موطا امام محمد کی شرح، التعلیق الممجد کے نام سے تحقیق و تعلیق اور حواشی کے ذریعہ پیش کیا، ان کا تازہ ترین اور اہم ترین کارنامہ صحیح بخاری کے جامع ترین نسخہ کی اشاعت ہے پندرہ جلدوں میں یہ محدث شہیر مولانا احمد علی سہارن پوری کے حاشیہ اور دس مستند نسخوں سے موازنہ اور برسوں کی محنت شاقہ کے بعد اب شائع ہو گیا ہے، دس نسخوں میں امام صغانی کا ایک نادر ترین نسخہ بھی شامل ہے، علمائے عرب و عجم نے اس بیش قیمت تحفہ کو سر آنکھوں پہ رکھا، دارالمصنّفین کو مسرت بلکہ فخر اس پر بھی ہے کہ ہندوستان کی اس خوش نصیبی میں اعظم گڈھ اور اس سے زیادہ دارالمصنّفین کا ایک رکن رکین شامل ہے۔

الحمدللہ دارالمصنّفین کی کتابوں کی دیدہ زیب طباعت کا سلسلہ جاری ہے اسی ماہ، مولانا عبدالماجد دریابادی کی مشہور و مقبول کتاب ''حکیم الامت'' کا نیا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے، شائقین کو عرصے سے اس کا انتظار تھا، خدا کرے یہ ہر طرح مقبول اور نافع ہو۔

مقالات

نورالعیون کا اصل ماخذ

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

مشہور سیرت نگار امام ابن سیدالناسؒ (محمد بن محمد بن عبداللہ بن یحییٰ اندلسی مصری، ۶۷۱ / ۱۲۷۲-۳۴-۷۳۳ / ۱۳۳۳) ایک عظیم عالم دین، محدث کبیر اور جلیل القدر سیرت نگار مولف تھے، ان کی متعدد تصانیف میں سیرت نبویؐ پر دو کتابیں یادگار ہیں: ایک ''عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر'' ہے وہ سیرت نبویؐ کے تمام گوشوں اور زاویوں کا احاطہ کرتی ہے جیسا کہ اس کا طویل، مفصل اور معنی خیز عنوان بتاتا ہے، وہ بالعموم ''عیون الاثر'' کے مختصر نام سے زیادہ معروف ہے اور اسی کے حوالے متاخر کتب سیرت میں بالعموم دیے جاتے ہیں۔ مؤسسۃ عزالدین بیروت سے وہ دو ضخیم جلدوں میں ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے جو اب تک کی بہترین طباعت ہے۔ قریب قریب نوسو صفحات پر پوری کتاب مبنی ہے۔ امام موصوف اور دوسرے سیرت نگاروں کے نزدیک وہ کتاب اعظم ہے۔

امام موصوف کی دوسری کتاب سیرت کا عنوان ہے: ''نورالعیون فی تلخیص سیر الامین المامون'' جیسا کہ عنوان ہی معنی کی ترسیل کرتا ہے وہ ایک مختصر سیرت ہے اور کل تیس پینتیس صفحات کا رسالہ ہے۔ کتابیات نگاروں اور سوانح و تذکرہ نویسوں کے مطابق چھپ بھی چکا ہے۔ کم از کم ۱۹۵۴ء کے ایک مصری مطبوعہ نسخہ کا ذکر ملتا ہے، اس کی دوسری طباعتیں بھی رہی ہوں گی کیونکہ وہ خاصا مقبول رسالۂ سیرت رہا ہے لیکن ہمیں کوئی مطبوعہ نسخہ نہیں مل سکا۔ البتہ اس کے متعدد نسخے دستیاب ہیں اور ان میں سے ایک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کے

ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی، ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ذخیرہ مخطوطات میں موجود ہے۔اس مخطوطہ کی تفصیل یہ ہے: شیفتہ کلیکشن ۱۳۱/۹۹ ع،اوراق:۱۶۔
آخر میں ترقیمہ نہیں ہے لہٰذا اس مخطوطہ کے کاتب اور تاریخ کتابت وغیرہ کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ قیاس سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ خاصا پرانا مخطوطہ ہے لیکن اس کا کاتب کوئی پڑھا لکھا شخص نہ تھا لہٰذا اس میں اغلاط کی تعداد بہت زیادہ ہے۔حاشیہ اور بین السطور بہت سی تشریحات اور سرخیاں ملتی ہیں۔ان کے بارے میں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے قلم سے ہیں۔

نور العیون کے بارے میں حضرت مولف نے خود اس کے مقدمہ میں تصریح کردی ہے کہ وہ ان کی مفصل کتاب سیرت ''عیون الاثر'' کا خلاصہ ہے جو انہوں نے چند اوراق میں پیش کردیا ہے۔اس کی تالیف کا خیال ان کو مفصل کتاب سیرت لکھنے کے بعد آیا تاکہ وہ ایک قریبی ماخذ بن سکے،جس کا نقل و اخذ آسان ہو، جو مبتدی کے لیے تبصرہ اور منتہی کے لیے تذکرہ بن جائے اور اس کا پورا نام بیان کر کے لکھا ہے کہ میں نے اسی نام سے اسے موسوم کیا ہے۔ان کی عبارت درج ذیل ہے "...... فلما وضعت كتابي المسمى "عيون الاثر في فنون المغازي والشمائل والسير" ممسعا في بابه ، مغنيا عما سواه لقاصدي هذا وطلابه، رأيت ان الحض في هذه الاوراق منه ما قرب ماخذه ونقله وسهل تناوله ، وحمل ما اودعته ذلك الكتاب ليكون للمبتدي تبصرة وللمنتهي تذكرة ، وسميته نور العيون في تلخيص سير الامين المامون" ۔(ورق ۱/ب)

حضرت مولف نے جب اتنی صراحت کے ساتھ کہہ دیا کہ وہ ان کی مفصل کتاب کا خلاصہ ہے تو بعد کے اہل علم نے ان کے بیان کو تسلیم کرلیا۔نہ تسلیم کرنے یا اس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔کیونکہ مولف گرامی خود معتبر و ثقہ ہیں۔اور ان سے قبل کئی سیرت نگاروں نے اپنی مفصل و مطول کتب سیرت کی تلخیصات پیش کی ہیں جن میں سے ایک امام ابن الجوزیؒ (۱۲۰۰/۵۹۷) بھی ہیں جنہوں نے اپنی مفصل سیرت کتاب الوفاء فی سیرۃ المصطفیٰ کا خلاصہ خلاصۃ الوفاء کے نام سے خود کیا تھا۔ان کے علاوہ دوسرے کئی اور ایسے سیرت نگار بھی ہیں اور متداول و مقبول کتب سیرت بالخصوص امہات الکتب کی تلخیصات و مختصرات کی تو ایک طویل فہرست موجود ہے۔جو امام ابن ہشام (عبدالملک بن ہشام،م ۸۳۳/۲۱۸) کی تہذیب و تلخیص سیرت ابن اسحاق (محمد بن

اسحاق، م ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) سے آج تک جاری ہے۔لہٰذا کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ان کی اپنی کتاب مفصل کی تلخیص نہیں ہے۔اسی بنا پر اوراسی اعتماد پر متاخرین اہل علم میں سے بیشتر نے نورالعیون کو عیون الاثر کا خلاصہ ہی قرار دیا۔ان میں سے چند اردو کے اہم سیرت نگاروں یا علوم وفنون اسلامی کے ماہرین کے بیانات کو محض اپنی بات کی تائید میں نقل کیا جاتا ہے تاکہ علمی دنیا کی اس بے تحقیق روایت کا ایک ثبوت بھی مل جائے کہ پیشرؤں کے بیانات کو کس طرح قبول کیا جاتا ہے۔

ہمارے عہد کے ایک بڑے صاحب قلم اور سیرت وسوانح نگار مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصانیف کے باب میں ان کے فارسی ترجمۂ نورالعیون کے بارے میں لکھا ہے کہ ''۲۷- سرورالمحزون (فارسی) ابن سیدالناس کی سیرت پر مشہور کتاب نورالعیون فی سیر الامین المامون کا خلاصہ ہے۔اپنے نامور معاصر اور سلسلہ مجددیہ کے شیخ کبیر حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی فرمائش سے تصنیف کیا''۔(تاریخ دعوت وعزیمت، لکھنؤ ۱۹۸۴ء، ۴۰۶/۵)

بہر حال مولانا موصوف نے اسے نورالعیون کا خلاصہ قرار دیا ہے جو دوسرا مسئلہ ہے، مولانا مرحوم کے حق میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے نورالعیون کو عیون الاثر کا خلاصہ بہر حال نہیں قرار دیا۔

مگر دو بہت ممتاز محققین کرام نے یہ بات بڑے شدومد کے ساتھ لکھی ہے۔ان میں ایک مفتی محمد مظہر مدظلہ ہیں جو لکھتے ہیں کہ ''ابن سیدالناس نے سیرت نبویؐ پر ایک ضخیم کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر تالیف کی پھر اس کا ایک جامع خلاصہ لکھا اور نورالعیون فی تلخیص سیر الامین المامون کے نام سے موسوم کیا۔سرورالمحزون اسی کا فارسی ترجمہ ہے''۔(محمد مظہر بقا، اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، کراچی، ۱۹، ۱۳۹ بحوالہ مقدمہ سرورالمحزون مترجم، ص ۸، معراج محمد بارق مقدمہ البلاغ المبین)

حجۃ اللہ البالغہ کے مدون وشارح اور محدث جلیل مولانا سعید احمد پالن پوری مدظلہ نے حضرت شاہؒ کی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے: ''۱۰- سرورالمحزون: ابن سیدالناس نے سیرت نبویؐ پر ایک ضخیم کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر'' لکھی تھی۔پھر اس کا جامع خلاصہ

''نور العیون فی تلخیص سیر الامین المامون'' کے نام سے کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے شیخ مرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے اصرار پر اس کا فارسی میں خلاصہ کیا ہے''۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ، مکتبہ حجاز دیوبند، ۲۰۰۱ء، ۱/۴۳)

دوسروں کو کیا کہیں خود خاکسار راقم نے اپنی ضخیم تالیف مصادر سیرت نبویؐ اور دوسرے مقالات و مضامین میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ نور العیون امام ابن سید الناس کی مفصل کتاب سیرت ہی کا خلاصہ ہے اور اسے مختصرات و تلخیصات میں ایک نئی روایت قرار دیا ہے کہ دوسروں کی مفصل کتابوں کی تلخیص تو ہوتی رہی ہے، امام موصوف نے اپنی کتاب مفصل کی تلخیص کر کے نئی طرح ڈالی۔

لیکن تاریخ و تنقید کی دنیا بڑی نرالی ہے اور خاصی ظالم بھی، وہ بہت سے اقوال و آراء کی پول کھول دیتی ہے، نئی نئی تحقیقات سامنے آتی ہیں اور وہ پرانے دعووں کا بھرم دور کر دیتی ہیں اور ان کے مدعیوں کے سامنے آئینہ رکھ دیتی ہیں۔ امام ابن سید الناسؒ کے نور العیون اور حضرت شاہؒ کے اس فارسی ترجمہ سرور المحزون کے موازنے اور دونوں کے متون کی تصحیح کے سلسلہ میں انکشاف ہوا کہ نور العیون براہ راست حضرت امام کی کتاب مفصل کی تلخیص نہیں ہے بلکہ ان کے ایک بزرگ پیش رو اور معاصر امام محبّ طبری (احمد بن عبداللہ، م ۶۹۴/۱۲۹۴) کے عظیم ''خلاصۃ سیر سید البشر'' کی تلخیص ہے۔ امام محبّ طبری کا مختصر رسالہ سیرت بہت مشہور و متداول اور مقبول رہا ہے اور غالبًا یہ مقبولیت اسے روز اول سے حاصل ہے کہ وہ چون صفحات کی چھوٹی تقطیع کا رسالہ ہے اور کئی بار چھپ چکا ہے۔ اپنے زمانے میں بھی وہ کافی شائع تھا۔ امام ابن سید الناس کی دونوں کتابوں کی تالیف سے قبل وہ مشہور و متداول تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن سید الناس نے اپنی دونوں کتابوں میں اس سے استفادہ کیا ہے اور مختصر سیرت نور العیون تو صرف اسی پر مبنی اور اسی سے ماخوذ ہے۔

اس پر مفصل و مدلل بحث تو خاکسار راقم کی کتاب ''شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا رسالہ سیرت سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون'' میں ملے گی، اس مختصر مقالے میں اس کی جہات اور شواہد پیش کیے جا رہے ہیں تا کہ قضیہ نزمین برزمین فیصل ہو جائے اور مفصل استدلال کے طالبان کرام مذکورہ بالا کتاب کی طرف رجوع فرمالیں۔ محبّ طبری کے مختصر سیرت خلاصۃ السیر اور ابن سید الناس کے

مختصر سیرت نور العیون کے موازنے سے پہلے موخر الذکر کی کتاب مفصل عیون الاثر سے ایک موازنہ و مقارنہ ضروری ہے، کم از کم دونوں کتابوں کے منہج و طریقۂ تالیف کی حد تک، پھر دونوں مختصرات کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس کے بنیادی ارکان یہ ہیں: ۱-ترتیب فصول کی مماثلت، ۲-ان فصول میں موضوعاتی مناسبت واشتراک، ۳-زبان و بیان کی یکسانیت، ۴-نور العیون میں نئی معلومات کی موجودگی، ۵-خلاصۃ السیر کی غلطیوں کی وفادار پیروی، ضعیف روایات کی بلا عقل نقل وغیرہ۔

عیون الاثر اور نور العیون کا منہجی اختلاف: مفصل یا روایتی کتب سیرت کا ایک خاص طریق تالیف امام سیرت ابن اسحاق نے اپنی کتاب مستطاب میں قائم کر دیا تھا، وہی طریقۂ تالیف قریب قریب تمام جانشین سیرت نگاروں نے کم از کم قرون وسطیٰ میں اختیار کیا ہے، صرف کہیں کہیں چند اضافات اور اضافی معلومات ضرور متعارف کرائی گئی ہیں لیکن طریق تالیف میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، مختصراً وہ طریق تالیف یہ ہے کہ آفاقی سیرت یا عالمی سیرت نگار ابتدائے آفرینش سے بحث شروع کرتے ہیں اور انبیائے کرام اور ان کی اقوام سے بحث کر کے سلسلۂ کلام اجداد نبوی سے جوڑ دیتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کے خاندان قریش، اجداد و آباء، والدین ماجدین کا مختصر مختصر ذکر کر کے سوانح نبویؐ پر ارتکاز کرتے ہیں۔ ولادت، رضاعت اور مکی پرورش و پرداخت کے بعد وہ قبل بعثت خاص خاص واقعات سیرت بیان کر کے بعثت و نبوت اور اس کے بعد کے واقعات جیسے تبلیغ و رسالت، تعذیب قریش، ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ وغیرہ کے واقعات کی روایات دیتے ہیں اور ہجرت کے بعد کے واقعات میں مغازی پر زیادہ زور دیتے ہیں، البتہ مغازی و سرایا کے دس سالہ عہد کے دوسرے واقعات کو بھی تاریخی ترتیب سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ بالعموم خاتمۂ کتاب وفات نبویؐ کے واقعات کے ساتھ ساتھ خلافت اسلامی کے قیام کی مختصر تاریخ پر ہوتا ہے۔ یہ پورا بیان تاریخی ترتیب پر مبنی ہوتا ہے۔

امام ابن سید الناس نے اپنی کتاب مفصل کو سیرت کے دو بنیادی ماخذوں - ابن اسحاق اور واقدی پر مبنی کیا ہے اور اس کی تصریح مقدمہ میں کر دی ہے اگرچہ دوسرے مآخذ سیرت و حدیث سے استفادہ بھی کیا ہے اور ان کی فہرست بھی آخر میں دے دی ہے۔

نور العیون کا طریق تالیف روایتی یا مفصل کتب سیرت سے قطعی مختلف ہے۔ وہ مختصرات

سیرت کا خاص منہج تالیف ہے، اس کی اولین طرح کس نے ڈالی تھی فی الحال معلوم نہیں لیکن وہ تیسری / نویں صدی کے اواخر میں پڑ چکی تھی اور مختصرات اسی کے مطابق لکھے جانے لگے تھے۔ امام ابن سید الناس کے پیش رو مختصرات حافظ عبدالغنی مقدسی جماعیلی اور بالخصوص امام محبّ طبری کے مختصرات میں وہ طریق تالیف ملتا ہے۔ اسے مختصر فصول سیرت کا طریق تالیف بھی کہا جاسکتا ہے۔ سیرت نبویؐ اور اس کے اطراف کو مختلف فصول کے تحت موضوعاتی ترتیب دی جاتی ہے اور ان میں توقیتی یا تاریخی ترتیب کا خیال نہیں رکھا جاتا بالعموم فصول مختصرات یہ ہوتی ہیں: نام ونسب نبویؐ، رضاعت و حضانت، مختصر مکی و مدنی سوانح، غزوات وسرایا، حج وعمرے، اسمائے نبویؐ، شمائل نبویؐ، اخلاق و فضائل نبویؐ، معجزات نبویؐ، ازواج مطہراتؓ، اولاد نبوی، اعمام وعمات نبوی، موالی وخدام نبوی، محافظین / حرس نبوی، سفراء نبوی، کاتبین نبوی، نجباء ورفقائے خاص، حیوانات ومواشی، اسلحہ جات، ملبوسات، مرض الوفات اور وفات نبویؐ۔

یہ تقریباً متفقہ فہرست فصول ہے۔ ان میں سے بعض کی ترتیب کسی کسی مختصر میں بدل جاتی ہے۔ کسی کسی میں ایک آدھ فصل کا اضافہ ہوجاتا ہے یا بعض میں کوئی فصل نہیں رکھی جاتی۔ یہ سب معمولی اختلافات ہیں۔ اصل منہج وطریق تالیف میں فرق نہیں آتا۔ اختصار وایجاز کے لحاظ سے بعض مختصرات میں معلومات یا تفصیلات کی کمی بھی کردی جاتی ہے جیسے معجزات میں کسی نے زیادہ، کسی نے کم کا ذکر کیا یا کسی نے ہر ایک معجزہ کو ذرا تفصیل سے اور الگ الگ بیان کیا جیسا محبّ طبری کا طریقہ ہے اور کسی نے چند معجزات کو ایک ہی عبارت میں گوندھ دیا جیسا کہ امام ابن سید الناس وغیرہ کا طریقہ ہے۔

حافظ مقدسی، محبّ طبری اور ابن سید الناس کے مختصرات ثلاثہ کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان تینوں کا بنیادی طریق تالیف یکساں ہے اور وہ مختصرات سیرت کے متعینہ طریق تالیف کے بالکل مماثل اور اسی جیسا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاں تفصیل واختصار اور ترتیب معلومات کا فرق ہے۔ اور اس کا ہونا لازمی بھی ہے: اول تو وہ شخصی ترجیح اور انفرادی پسند کا معاملہ ہے۔ اس سے زیادہ اہم دوسری بات یہ ہے کہ مختصر سیرت اگر جامع ہے جیسا کہ محبّ طبری کا خلاصۃ السیر ہے تو معلومات کی زیادتی کے سبب اس کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل مقدسی اور ابن سید الناس

کے مختصرات کی ضخامت کم ہے۔ دونوں محبّ طبری کے خلاصہ کے بھی خلاصے کہے جاسکتے ہیں کہ وہ خلاصۃ السیر کے نصف صفحات و اوراق پر مشتمل ہیں۔

ابن سید الناس کا مختصر سیرت نور العیون دراصل محبّ طبری کے خلاصۃ السیر کا خلاصہ ہے۔ تمام فصول یکساں ہیں اور ان کی معلومات بھی یکساں ہیں، بس ان کو ابن سید الناس نے اور مختصر کردیا ہے۔ اس اختصار و مختصر نویسی نے یا خلاصہ کے خلاصہ کرنے نے بعض اہم گل کھلائے ہیں جن کا ذکر آخری تجزیاتی تبصرہ میں کیا جائے گا۔ بہرحال یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ ان دونوں مختصرات کی فصول کا باہمی مطالعہ بتاتا ہے وہ محبّ طبری کے خلاصہ سے ماخوذ ہیں اور ابن سید الناس نے البتہ ان کی ترتیب کہیں کہیں بدل دی ہے جیسے محبّ طبری نے اسمائے نبویؐ کی فصل کے بعد شمائل کی فصل رکھی ہے، نور العیون میں ترتیب برعکس ہے۔ محبّ طبری نے معجزات کی فصل اخلاق نبویؐ کی فصل سے پہلے قائم کی ہے، نور العیون میں وہ آخری فصل وفات نبویؐ سے قبل لائی گئی ہے۔ بیشتر فصول دونوں میں بہرحال یکساں ترتیب رکھتی ہیں۔

نور العیون کی نئی معلومات: مختصر سیرت نور العیون میں بہت سی ایسی معلومات ملتی ہیں جو اس کے مبینہ ماخذ عیون الاثر میں نہیں ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نئی معلومات یا اضافی روایات کہاں سے آئیں؟ وہ ان کے حافظہ کی جولانیاں بھی سمجھ لی جائیں تو بھی بہرحال ان کا کوئی نہ کوئی ماخذ مکتوبہ ضرور ہوگا۔ عیون الاثر کی روایات یا معلومات کے نور العیون میں نہ پائے جانے کی توجیہ تو یہ کی جاسکتی ہے کہ اختصار کی وجہ سے ان کو مختصر سیرت میں ساقط کردیا مگر نئی معلومات کے اضافہ کی توجیہ اس کے سوا اور کیا کی جاسکتی ہے کہ کسی غیر کی گلکاری ہے۔ اس کی چند ٹھوس مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱- عیون الاثر میں ابن اسحاق / واقدی وغیرہ کی مانند مختلف واقعات کے ضمن میں رسول اکرمؐ کی عمر شریف کا حوالہ برابر ملتا ہے مگر وہ صرف سال کی تحدید کرتا ہے جیسے ولادت کے وقت والد ماجد نہیں تھے، وفات والدہ کے وقت آپؐ کی عمر چھ سال تھی یا وفات جد امجد کے وقت آٹھ سال کی تھی۔ ان میں سے بہت سے واقعات کے حوالے سے عمر شریف نہیں بھی ملتی۔

۲- عیون الاثر کے برخلاف نور العیون میں رسول اکرمؐ کی عمر شریف کا ذکر سال، ماہ اور دنوں کی قید کے ساتھ ملتا ہے، یہ قطعی عمر عیون الاثر میں کہیں نہیں ہے البتہ وہ خلاصۃ السیر میں ضرور

موجود ہے جیسے وفات عبدالمطلب کے وقت عمر شریف آٹھ سال، دو ماہ، دس دن بتائی گئی ہے یا ابوطالب ہاشمی کے ساتھ سفر شام کے وقت بارہ سال، دو ماہ، دس دن بتائی گئی۔ نکاح خدیجہؓ کے وقت پچیس سال، دو ماہ دس دن لکھی ہے۔ ایسے ہی واقعہ معراج، ہجرت مدینہ وغیرہ کے ضمن میں متعینہ عمریں ملتی ہیں، وہ سب محبّ طبری نے تو بیان کی ہیں مگر عیون الاثر میں نہیں ہیں۔ البتہ اس بیان طبری پر یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ ان تمام متعینہ عمروں کا ماخذ کیا ہے۔ کیا سارے واقعات ایک ہی ماہ میں پیش آئے تھے؟ یہ دوسری تحقیق طلب بات ہے جس سے اس وقت بحث نہیں۔

۳- نور العیون میں ابتدائے نبوت کی تاریخ چالیس سال اور ایک دن بتائی گئی ہے، وہ محبّ طبری میں ہے، عیون الاثر میں نہیں ہے۔

۴- عیون الاثر میں حضرت خدیجہؓ کے مہر کا کوئی حوالہ نہیں، نور العیون میں بارہ اوقیہ سونا بتایا گیا ہے جس کا ذکر خلاصۃ السیر میں ہے۔

ایسی متعدد نئی معلومات نور العیون میں ملتی ہے جو عیون الاثر میں نہیں ہیں اور خلاصۃ السیر طبری سے مستعار لی گئی ہیں جیسے سفراء نبوی میں حضرات ابوموسیٰؓ و معاذ بن جبلؓ کا ذکر، اخلاق نبوی میں تین خواتین سے مزاح نبوی کے واقعات۔

راجح مرجوح کا اختلاف: عیون الاثر اور نور العیون کے تقابلی مطالعہ سے ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جو خاصا معنی خیز ہے۔ کتاب مفصل میں جو روایت راجح آئی ہے وہ نور العیون میں مرجوح بن گئی ہے یا معاملہ اس کے برعکس بھی بعض جگہ ہوگیا ہے۔ اس کی چند مثالیں پیش ہیں:

وفات والدہ ماجدہ کے وقت دوسری تمام کتب سیرت کی مانند عیون الاثر میں رسول اکرمؐ کی عمر شریف چھ سال بتائی گئی ہے جو ابن اسحاق کی بیان کردہ ہے۔ نور العیون میں چار سال کی عمر کو راجح بتایا گیا ہے اور چھ سال کی روایت کو مرجوح کیونکہ خلاصۃ السیر میں ایسا ہی لکھا ہے۔

قریش کے مقاطعہ کے نتیجہ میں ابو طالب ہاشمی کے ماتحت دو خاندانوں - بنو ہاشم اور بنو مطلب - کو محاصرہ میں تین سال تک رہنا پڑا تھا۔ اس میں مسلمانان بنی ہاشم و بنی مطلب کے ساتھ ان دونوں کے غیر مسلم بھی شامل تھے۔ تمام کتب سیرت کی طرح عیون الاثر میں یہی بیان ملتا ہے۔ مگر نور العیون میں ہے کہ رسول اکرمؐ کو اہل بیت کے ساتھ محصور کردیا گیا تھا۔ یہی بیان خلاصۃ السیر میں ہے۔

ہجرت مدینہ کی تاریخ ،عیون الاثر میں دوشنبہ ۱۲/ ربیع الاول ہے کیونکہ اس کے ''ماخذین'' ابن اسحاق و واقدی میں بھی وہی ہے مگر نور العیون میں وہ دوشنبہ ۸/ربیع الاول بن گئی ہے اور دوشنبہ کو ہی مدینہ میں داخلہ کی تاریخ دی گئی ہے، جو ایک ہفتہ کے بعد ہی ممکن تھی ۔ یہ دونوں غلطیاں خلاصۃ السیر سے مستعار لی گئی ہیں کہ اس میں یہی عبارت موجود ہے۔

غزوات نبوی کی تعداد عیون الاثر میں ستائیس بیان کی گئی ہے جو ابن اسحاق و واقدی کے بیانات سے ماخوذ ہے مگر نور العیون میں ستائیس غزوات کی روایت کو مرجوح اور پچیس غزوات کی روایت کو راجح کہا ہے اور یہ دوسری روایت عیون الاثر میں نہیں ہے ۔ البتہ یہ روایت اور راجح مرجوح دونوں کا اختلاف خلاصۃ السیر میں موجود ہے اور نور العیون میں اس سے ماخوذ ہے۔

خلاصۃ السیر اور نور العیون کی عبارت کی یکسانیت: ابن سید الناس کے مختصر سیرت نور العیون اور محبّ طبری کے خلاصۃ السیر کی عبارتوں میں کافی یکسانیت ہے، اکثر فصول میں تو ساری کی ساری عبارتیں ایک جیسی ہیں، سوائے ان مقامات کے جن کی تلخیص نور العیون میں کردی گئی ہے، ظاہر ہے کہ اس کی محذوف عبارتیں خلاصۃ السیر میں ملتی ہیں لیکن نور العیون میں موجود تمام عبارتیں خلاصۃ السیر سے ہی ماخوذ معلوم ہوتی ہیں کہیں کہیں ابن سید الناس نے عبارتوں میں تبدیلی کی ہے اور وہ تبدیلی ایک آدھ فقرے یا جملے سے زیادہ الفاظ و کلمات کی ہے ۔ خلاصۃ السیر اور نور العیون دونوں کی بعض مماثل عبارتوں کے نمونے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ دعویٰ مدلل ہوجائے۔

۱- حضانت ام ایمن : وحضنة ام ایمن الحبشية حتی کبر فا عتقها و زوجها زید بن حارثه ۔ خلاصة السير فولدت له اسامة وکان ورثها من ابيه **بعد میں ہے۔**

وحضنة ام ایمن برکة الحبشية ، وکان ورثها من ابيه ، فلما کبر اعتقها و زوجها زيد بن حارثة -**نور العیون۔**

۲- وفات وکفالت عبد المطلب: فلما بلغ ثمانی سنين وشهرين و عشرة ايام توفی عبد المطلب فوليه عمه ابو طالب - خلاصة السير ۔

وکفله جده عبد المطلب ، فلما بلغ ثمانی سنين و شهرين وعشرة ايام توفی عبد المطلب فوليه عمه ابو طالب -**نور العیون۔**

۳-اولین سفر شام اور بحیرا کی ملاقات: فلما بلغ اثنتی عشرة سنة وشهرين وعشرة ايام خرج مع عمه ابی طالب الی الشام ، فلما بلغ بصریٰ رآه بحیرا الراهب فعرفه بصفته فجاء ه واخذ بيده ...... **خلاصۃ السیر** ۔

نور العیون میں یکساں عبارت موجود ہے، بس فرق یہ ہے "فلما" کی جگہ "ولما" ہے اور بعد میں چند فقرے نہیں ہیں۔

۴- دوسرا سفر شام: خلاصہ اور نور دونوں کی عبارت یکساں ہے۔ دوسرے راہب کی پیش گوئی کی عبارت میں تلخیص کی گئی ہے۔

۵-حضرت خدیجہؓ سے شادی: رسول اکرمؐ کی عمر شریف اور شادی اور حضرت خدیجہؓ کے مہر وغیرہ کی عبارات یکساں ہیں۔

۶- بدء نبوت اور نزول قرآن بذریعہ حضرت جبریل کی روایات دونوں میں پوری طرح یکسانیت رکھتی ہیں، خلاصہ میں تفصیل ہے۔

۷- دوسری فصول جیسے حج وعمرات نبویؐ، اسمائے نبویؐ، اخلاق نبویؐ، ازواج مطہراتؓ، اعمام وعمات، غرض کہ تمام فصول میں اسی طرح کی یکساں عبارتیں دونوں میں ہیں۔ جہاں جہاں ابن سید الناس نے خلاصۃ السیر کی تلخیص کی ہے وہاں فرق آ گیا ہے مگر نور العیون میں تمام موجود جملے اور فقرے خلاصۃ السیر میں پائے جاتے ہیں۔ اور تو اور، آخری فصل وفات نبویؐ کا خاتمہ یکساں عبارتوں پر ہوتا ہے جو قبر کے کھودنے والوں کے حوالے سے آئی ہیں۔

غلطیوں کا اعادہ: دونوں کے موازنے سے ایک دلچسپ چیز یہ نظر آتی ہے کہ محبّ طبری نے اگر اپنی کتاب میں کوئی غلط روایت ضعیف رموضوع روایت نقل کی ہے تو ابن سید الناس نے اس کو بھی جوں کا توں نقل کر دیا ہے اور ان کی تصحیح نہیں کی ہے ایسی بہت سی روایات ہیں جیسے:

جمرۃ الوسطی کے پاس ایام تشریق کے دوران حمل نبویؐ کا قرار پانا۔

ولادت نبویؐ کے وقت ایوان کسریٰ میں لرزش ہونا، اس کے چودہ کنگروں کا گرنا، نار فارس کا بجھ جانا اور چشمہ ساوہ کا خشک ہو جانا۔

بحیرا راہب اور دوسرے راہب کی پیش گوئیاں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے راہب

کا نام محبّ طبری نے نہیں لیا تو ابن سید الناس نے بھی نہیں لیا۔ وہ اضافہ کر سکتے تھے جیسا کہ حضرت ام ایمن کے نام برکہ کا اضافہ کیا تھا۔

معجزات نبویؐ کی فصول میں ایسی ضعیف روایات بہت ہیں جیسے: غار ثور میں بہ وقت ہجرت مکڑی کا جالا بننا۔ بعض جانوروں، درختوں وغیرہ کی شہادت نبوت، قصہ مازن بن عضوبہ اور قصہ قارب بن سواد۔

رسول اکرمؐ کے سامان جنگ میں حضرت داؤدؑ کی زرہ (درع) کا شمول بھی ایک ضعیف / موضوع روایت ہے۔

وفات کی فصل میں غسل نہ دینے کی ندائے ابلیس اور غسل دینے کی ندائے خضر وغیرہ۔ کفن کی چادروں کے فرشتوں کے ذریعہ بنے جانے کی روایت ضعیف ہے۔

ان کے علاوہ متعدد مقامات پر محبّ طبری کی روایات میں بعض تسامحات واغلاط در آئے ہیں اور جن کو واقعاتی خلا بھی کہا جا سکتا ہے، وہ بھی نور العیون میں جوں کا توں موجود ہیں۔ ان میں سب سے اہم غلطی یہ ہے کہ عرفات سے واپسی پر مزدلفہ میں قیام شب کے دوران مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کا ذکر خلاصۃ السیر میں رہ گیا ہے تو وہ نور العیون میں بھی ہے، ہجرت مدینہ کے ضمن میں دونوں نے دوشنبہ ۸/ ربیع الاول کو مکہ سے روانگی قرار دی ہے اور دوشنبہ ہی کو مدینہ میں داخلہ بھی بتایا ہے یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ شعب ابی طالب / بنی ہاشم میں بنو ہاشم و بنو مطلب کے محصور ہونے کے بجائے اہل بیت نبوی کا محصور ہونا بھی غلط ہے، ازواج مطہرات میں حضرت سودہؓ اور حضرت حفصہؓ کے طلاق دینے کی روایات بھی ضعیف ہیں اور حضرت سودہؓ کے اس خوف سے حضرت عائشہؓ کو اپنی باری دینے کا واقعہ تو بالکل غلط ہے۔ لیکن اس غلطی کا صدور تو بہت سوں سے ہوا ہے کہ روایات واحادیث کا صحیح تجزیہ نہیں کیا گیا۔

تنقیدی تبصرہ: امام ابن سید الناس کا بلاشبہ یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے چند اوراق میں سیرت نبویؐ پیش کر دی ہے جس کی تعریف کرتے ہوئے ہمارے مشرقی مزاج کے حامل علمائے کرام اور اکابر سے کورانہ عقیدت رکھنے والوں نے اسے جامع رسالۂ سیرت اور جامع خلاصہ قرار دیا ہے۔ اگر کوئی جامع مختصر سیرت ہے تو محبّ طبری کا خلاصۃ السیر ہے کہ وہ تمام ضروری معلومات پیش کرتا

ہے اور تمام فصول کو جامع بناتا ہے۔ ان میں نہ معلومات کا خلا ہے اور نہ بیانیہ کی تشنگی۔ وہ سیرت نبویؐ اور اطراف سیرت دونوں کا جامع ہے اگرچہ بعض فصول بالخصوص معجزات کی طویل ترین فصل کو اور مختصر کر کے جامع تر بنایا جاسکتا تھا۔

نور العیون کے مولف گرامی یا تلخیص نگار نے کہیں کہیں غیر ضروری تفصیلات و جزئیات تو لے لی ہیں اور بسا اوقات ضروری تفصیلات چھوڑ دی ہیں۔ محبّ طبری کے خلاصہ کی تلخیص مزید کرتے ہوئے درمیان سے عبارتیں ساقط کی ہیں تو بیانیہ میں خلا پیدا ہوگیا ہے، نہ صرف معلومات کا بلکہ بیان و پیش کش کا، بعض مقامات پر اختصار اتنا شدید ہے کہ عام قاری کے لیے مطلب سمجھنا مشکل ہے۔ وہ عبارت یا مقام صرف اہل علم کے لیے خاص بن کر رہ جاتا ہے جو اس کی متعلقہ روایات کو پہلے سے جانتا ہے۔ اسی تلخیص شدید کا ایک اور برا نتیجہ یہ ہے کہ واقعات میں تاریخی یا زمانی ترتیب قائم نہیں رہ سکی، بعد کی روایت یا واقعہ پہلے آگیا ہے اور پہلے کا بعد میں چلا گیا ہے۔ اس کا ایک اور اثر بد ہے کہ مختصر سہی مگر ایک ہی روایت یا واقعہ بار بار آیا ہے یعنی تکرار کا عیب پیدا ہوگیا ہے۔ عبارتوں یا بیانیہ میں خلا سے یہ احساس قاری کو ہوتا ہے کہ اس جگہ کوئی ضروری چیز چھوٹ گئی ہے، بیانیہ کے جملے دراصل اسے کافی بے ربط لگتے ہیں۔ ان خلاؤں یا نقصانات کی چند مثالیں دی جاتی ہیں:

رسول اکرمؐ کی بعثت کے بعد کی زندگی بالخصوص مکی دور میں تبلیغ وارشاد وغیرہ کے اہم ترین واقعات کو اڑا دیا گیا ہے۔ خفیہ و علانیہ تبلیغ، سابقین اولین، ہجرت حبشہ، تعذیب مسلمین، سفر طائف جیسے اہم واقعات نور العیون میں نہیں ہیں، مکی زندگی کی پوری فصل ناقص ہے اور مدنی زندگی پر بھی کوئی فصل نہیں باندھی، غزوات وغیرہ کے علاوہ دوسرے واقعات کا ذکر نہیں کیا حالانکہ عیون الاثر میں مدنی دور حیات پر ایک شاندار مختصر فصل ہے، وہی نور العیون میں دی جاسکتی تھی لیکن وہ محبّ طبری نے نہیں لکھی تھی۔

غزوات و سرایا کی فصل نور العیون انتہائی ناقص ہے، غزوات میں صرف ان کے اسماء ہیں اور وہ بھی کارزار و قتال والوں کے، سرایا کی صرف تعداد ہے اور وہ بھی ظنی قسم کی۔ ان میں تھوڑی تفصیل ضروری تھی جیسی محبّ طبری نے دی ہے۔

حجۃ الوداع کی فصل میں پوری تفصیل ہے اور وہ غالباً سنت کے طریقہ کو بتانے کے لیے

دی ہے۔اس میں بعض روایات یا بیانات کی تلخیص کر کے اور ضروری معلومات پیش کر کے اسے جامع تر بنایا جا سکتا تھا۔

ایک اہم خلا یا خامی یہ ہے کہ پورے مختصر نور العیون میں تقویمی تاریخیں نہیں دی گئی ہیں۔ حالانکہ بہت سے مقامات پر ان کا اظہار اور اعلان ضروری ہے۔ جیسے مکی و مدنی واقعات، غزوات کے سنین یا حجۃ الوداع ہی کی توقیت حتیٰ کہ وفات نبویؐ کے ضمن میں تاریخ میں صرف دن اور بارہ ربیع الاول کا ذکر ہے مگر سنہ کا ذکر نہیں۔

جسمانی شمائل کی فصل خاصی مختصر کر دی ہے مگر اخلاق و فضائل کی فصل کافی مفصل اور مشرح ہے اور وہ بلاشبہ سیرت نبویؐ کا حسین ترین پہلو پیش کرتی ہے۔ رسول اکرمؐ کے اخلاق عالی کی یہ فصل بہت سی احادیث کا مجموعہ ہے اور جس مختصر نگار نے اسے پہلے پہل مرتب کیا تھا وہ صاحب دل و نظر محدث جلیل ہی نہیں بلکہ سیرت نبویؐ کے فن کا بھی ماہر تھا۔ اس سے قاری کو یہ پیغام ملتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے اخلاق اپنانے ہی میں دنیا وآخرت کی سعادت ہے۔

اسمائے نبویؐ کی فصل بھی کافی عمدہ تلخیص رکھتی ہے اور بڑی حد تک جامع ہے۔ اس کا آخری جملہ کہ رسول اکرمؐ کے اکثر اسماء آپؐ کے صفات ہیں بڑا معنی خیز ہے۔

اسی طرح ازواج مطہرات پر فصل بھی کافی اچھی ہے اور ضروری معلومات دیتی ہے اگرچہ اس میں شادیوں کے سنین کی کمی کھٹکتی ہے۔ ویسے ازواج مطہرات کی ترتیب زمانی اور تاریخی ہے۔ اولاد بالخصوص بنات طاہرات کی فصل بھی مناسب ہے جبکہ اعمام و عمات، موالی، خدام کی فصول صرف اسماء پر مشتمل ہیں۔ سفرائے نبویؐ کی فصل بھی ضروری معلومات دیتی ہے۔ حیوانات کی فصل میں کافی سے زیادہ معلومات جمع کر دی ہیں، ان کی تلخیص مزید کی جا سکتی تھی جیسے ملبوسات و متروکات کی فصول میں کیا ہے۔ وفات نبویؐ کی فصل میں تکرار، ترتیب معلومات کا اختلاف، بعض غیر ضروری روایات ملتی ہیں اور اس کا خاتمہ بھی صحیح نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ محبّ طبری کے خلاصۃ السیر کا خلاصہ ابن سید الناس بہت معیاری نہیں ہے۔ وہ اور بہتر کیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ خلاصۃ السیر میں بعض غیر ضروری روایات اور تفصیلات ہیں تاہم وہ ابھی تک کی معلومات کے مطابق سب سے بہتر اور جامع ترین مختصر سیرتؐ ہے۔

برصغیر میں حجیت حدیث کے بارے میں موجود لٹریچر کا جائزہ

ڈاکٹر محمد عبداللہ عابد

قرآن مجید انسانیت کی ہدایت کے لیے ایک کامل اور واضح کتاب ہے۔ مگر قرآن کی زبان، اس کی اصطلاحات اور اس کے احکام کے منشاء اور تفاصیل کو سمجھنے کے لیے رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ اس رہنمائی کا سب سے بڑا ذریعہ رسول اکرمؐ ہیں۔ کیونکہ نہ صرف قرآن پاک بذریعہ وحی رسول اکرمؐ کی طرف نازل کیا گیا بلکہ اس کی تبیین اور تشریح بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں شامل تھی۔ اس سلسلے میں دوسری اہم بات جو قرآن کے مطالعے سے واضح ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی آپؐ کی طرف وحی کا نزول ہوتا تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اللہؐ کی طرف نازل کیے گئے کلام الٰہی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی متلو یعنی قرآن مجید اور دوسری وحی غیر متلو یعنی احادیث رسولؐ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات قرآن مجید اور حدیث رسولؐ دونوں سے مل کر مکمل ہوتی ہیں۔ یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ ان دو بنیادی ماخذ شریعہ میں سے کسی کا انکار کیا جائے یا دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہؐ کے عہد مبارک سے لے کر آج تک امت مسلمہ نے متفقہ طور پر قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کو حجت شرعی تسلیم کیا ہے۔ البتہ بعض گمراہ فرقوں نے اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے حدیث رسولؐ کو قرآن مجید سے جدا کرنے کی کوشش کی اور حدیث کو حجت شرعی ماننے سے انکار کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں خوارج اور معتزلہ نے انکار حدیث کا فتنہ اٹھایا۔ اس فتنہ کا مرکز عراق تھا۔ خوارج نے اپنے انتہا پسندانہ نظریات اور معتزلہ نے یونانی فلسفوں سے متاثر ہو کر حدیث کا انکار کیا۔

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان، پاکستان۔

حافظ ابن حزم لکھتے ہیں کہ اہل سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ تمام فرقے آنحضرتؐ کی ان احادیث کو جو ثقہ راویوں سے منقول ہوں برابر قابل حجت سمجھتے رہے یہاں تک کہ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ آئے اور انہوں نے اس اجماع کے خلاف کیا۔(۱)

حدیث رسولؐ کے حجت شرعی ہونے پر تمام فقہی مذاہب کا شروع سے لے کر آج تک مکمل اتفاق رہا ہے اور اس بارے میں کبھی کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

> ''یہ دلیل زیادہ فیصل اور یقین افروز ہے کہ وہ تمام مذاہب فقہی جن پر دوسری صدی کے اوائل سے لے کر تیسرے صدی کے آخر تک مختلف مدارس فکر کی عمارتیں کھڑی کی گئیں اور جو پوری دنیائے اسلام کے مشعل راہ رہے۔ ان میں سنت قدر مشترک کے طور پر موجود ہے۔ سب نے اس کی حجیت کو برابر مانا اور تسلیم کیا، یہی نہیں بلکہ شریعہ کی نہایت ضروری اساس قرار دیا ہے''۔(۲)

خوارج اور معتزلہ کی طرف سے انکار حدیث کے فتنے کا بہت جلد قلع قمع ہوگیا اور پھر تیرہویں صدی ہجری تک پوری اسلامی دنیا میں کسی کو بھی انکار حدیث کی جسارت نہ ہوئی۔ تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں انکار حدیث کا دوسرا فتنہ اٹھا۔ جس کا مرکز برصغیر پاک و ہند تھا۔ محققین علمائے کرام کی آراء کے مطابق برصغیر پاک و ہند میں فتنہ انکار حدیث کو سرسید احمد خان، مولوی چراغ علی، عبداللہ چکڑالوی، احمد الدین امرت سری، مولانا اسلم جیراج پوری اور چودھری غلام احمد پرویز نے فروغ دیا۔(۳)

خوارج اور معتزلہ قدیم منکرین حدیث اور برصغیر میں انکار حدیث کے علم بردار جدید منکرین حدیث کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ قدیم منکرین حدیث اور جدید منکرین حدیث کے انکار حدیث کے سلسلے میں اغراض و مقاصد، حدیث کے بارے میں شبہات اور انکار حدیث پر مبنی دلائل مختلف ہیں۔ قدیم منکرین حدیث دین سے مکمل آزادی نہیں چاہتے تھے۔ جب کہ برصغیر کے منکرین حدیث کی تحریروں سے یہ بات واضح ہے کہ انکار حدیث سے ان کا مقصود الحاد و لادینیت ہے اور دین سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔

انکار حدیث کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً حدیث کو حجت شرعی اور ماخذ شریعت اسلامیہ ماننے سے مکمل کھلم کھلا انکار کرنا''احادیث کو مشکوک بنانا'' مختلف احادیث کی صحت سے انکار کرنا، سلف کے طریقوں سے ہٹ کر اپنی خواہش نفس سے احادیث سے استنباط مسائل کرنا اور غلط تاویلیں پیش کرنا وغیرہ۔ جہاں تک برصغیر کے منکرین حدیث کے اعتراضات وشبہات کی نوعیت کا تعلق ہے تو ان کے تمام اعتراضات کا مقصود دو چیزیں ہیں۔ایک یہ کہ احادیث کے بارے میں یہ شک پیدا کیا جائے کہ کیا وہ واقعی حضورؐ سے منقول ہیں یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر احادیث واقعی حضورؐ سے منقول ہیں تو کیا وہ ہمارے لیے حجت ہیں۔منکرین حدیث یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضورؐ کے ذمہ صرف قرآن پہنچا دینا تھا۔قرآن پہنچا دینے کے بعد آپؐ کی سنت کیسے حجت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ منکرین حدیث کے تمام شبہات میں مذکور بالا مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔انکار حدیث کے لیے منکرین حدیث نے مختلف حربے استعمال کیے مثلاً حدیث کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے مستشرقین کی طرف سے حدیث پر کیے گئے اعتراضات کی نقل کی،قرآن مجید کی معنوی تحریف کی، مفسرین، محدثین اور فقہائے کرام کی خدمات کو ساقط الاعتبار قرار دیا۔احادیث کے مجموعوں میں عیب نکالے اور صرف قرآن ہی کو شریعت اسلامیہ کا ماخذ قرار دیا۔ بلکہ انکار حدیث میں اس قدر بڑھے کہ حدیث رسولؐ کے بارے میں بے بنیاد اور من گھڑت شبہات واعتراضات کو ثابت کرنے کے لیے تصنیف وتالیف کا بہت بڑا دفتر کھولا اور اپنے مشن میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔(۴)

برصغیر پاک و ہند میں انکار حدیث کے فتنے کے نمودار ہوتے ہی اس خطے کے جید علمائے کرام اور محققین اسلام نے اس فتنہ کے خطرات اور مضمرات کو بھانپ لیا۔لہٰذا انہیں اس کے انسداد کی سخت فکر لاحق ہوئی۔ چنانچہ انکار حدیث کے فتنہ کے خلاف برصغیر کے علمائے کرام نے بیسیوں کتب لکھیں۔جن میں نہ صرف حجیت حدیث کو قرآن مجید وحدیث اور عقلی وتاریخی حقائق سے ثابت کیا گیا بلکہ منکرین حدیث کے حدیث رسولؐ کے بارے میں من گھڑت شبہات، حدیث کے بارے میں بے بنیاد اعتراضات اور حدیث کی شرعی حیثیت کو مشکوک بنانے کے اقدامات کا پرزور علمی، تحقیقی اور مستند دلائل سے رد پیش کیا گیا۔فتنہ انکار حدیث کے خلاف جہاد میں برصغیر کے مختلف دینی رسائل و جرائد نے بھی خصوصی نمبر شائع کیے اور مضامین لکھے(۵)۔مزید برآں فتنہ

کے تدارک کے لیے منکرین حدیث سے علمی مناظرے بھی کیے گئے نیز دینی اجتماعات میں عوام الناس کو فتنۂ انکار حدیث کے عواقب و مضمرات سے بھی آگاہ کیا گیا۔

برصغیر کے علمائے حق نے حجیت حدیث کے موضوع پر جو تصنیفی و تالیفی کاوشیں کیں اور جو لٹریچر دیا وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور پورے برصغیر پاک و ہند میں پھیلا ہوا ہے۔ برصغیر میں حجیت حدیث کے موضوع پر موجود اس وسیع لٹریچر کا جائزہ اس طرح ممکن ہے کہ لٹریچر کے بارے میں دو پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے۔ ایک یہ کہ حجیت حدیث پر تصانیف و تالیفات کا تعارف پیش کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ فتنۂ انکار حدیث کے رد میں حجیت حدیث کے لٹریچر میں دیے گئے دلائل کا جائزہ لیا جائے کہ کہاں تک منکرین حدیث کے شبہات و اعتراضات کی تردید اور ابطال ہو سکا ہے۔ چنانچہ مقالہ کو دو فصول میں منقسم کیا گیا ہے۔ فصل اول میں برصغیر میں حجیت حدیث کے لٹریچر کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ فصل دوم میں فتنۂ انکار حدیث کے رد میں حجیت حدیث کے لٹریچر میں دیے گئے دلائل و براہین کی تفصیل اور ان کے اثرات بیان کیے گئے ہیں۔

فصل اول

اس فصل میں حجیت حدیث پر درج ذیل اقسام کی تصانیف و تالیفات کا تعارف شامل ہے:

(الف) خالصتاً فتنۂ انکار حدیث کے رد اور حجیت حدیث کے موضوع پر مرتب شدہ کتب۔

(ب) حجیت حدیث کے دلائل پر مبنی عام کتب۔

(ج) کتابت و تدوین حدیث کے موضوع پر وہ کتب جو حدیث کو حجت شرعی ثابت کرنے کے لیے تحریر کی گئیں۔

(د) حدیث کی مختلف شروح کے مقدمات جن میں حدیث کی حجیت اور اہمیت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔

(ر) حجیت حدیث پر عربی زبان کی وہ کتب جن کے اردو تراجم ہو چکے ہیں اور ان کا مواد برصغیر کے منکرین حدیث کے شبہات کا رد پیش کرتا ہے۔

واضح رہے کہ برصغیر میں حجیت حدیث پر تصانیف و تالیفات کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق سو سے زیادہ ہے چونکہ ان سب کا احاطہ دشوار ہے۔ لہٰذا اس فصل میں حجیت حدیث پر برصغیر

کے موثر لٹریچر پر مبنی قریباً چالیس کتب کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جب کہ باقی کتب کے عناوین کو بیان کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ موثر لٹریچر پر مبنی کتب کا تعارف سن عیسوی کی ترتیب کے مطابق ہے۔

حجیت حدیث اور اتباع الرسول

(مولانا ثناء اللہ امرت سری، ہندوستان، امرت سر، کتاب خانہ ثنائیہ، نومبر ۱۹۲۹ء، صفحات ۶۴)

انکار حدیث کے فتنے کے اٹھنے کے بعد منکرین حدیث کے مبنی بر انکار حدیث نظریات کی تردید کے سلسلے میں ۱۹۲۹ء میں مولانا ثناء اللہ امرت سری کا ''حدیث نبویؐ حجت شرعی اور اتباع رسولؐ راہ ہدایت'' کے موضوع پر ایک تحریری مباحثہ منکر حدیث مولوی احمد اللہ بن امرت سری سے خط و کتابت کی شکل میں ہوا۔ مولف نے ضروری تمہید کے ساتھ خط و کتابت کو کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ مولف نے زوردار علمی دلائل سے منکرین حدیث کے شبہات و اعتراضات کو رد کر کے حدیث کا حجت شرعی ہونا اور اتباع رسولؐ کا لازمی ہونا ثابت کیا ہے۔ نیز منکرین حدیث کے ایک ایک شبہے کا علاحدہ علاحدہ تفصیلی جواب دے کر ان کے موقف کا رد کیا۔ حجیت حدیث کے ادب میں یہ تالیف ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

کتابت حدیث

(سید منت اللہ رحمانی، دہلی، مکتبہ برہان۔ اردو بازار، نومبر ۱۹۵۰ء، صفحات ۸۰)

زیر نظر رسالہ میں مولف نے فن حدیث کے بارے میں پوچھے گئے ایک اہم سوال کا محققانہ اور مستند جواب کتابت حدیث کے عنوان سے پیش کر کے منکرین حدیث کے بنیادی شبہہ کو رفع کر کے حدیث کی عظمت، حجیت اور مقام کو اجاگر کیا ہے۔ مولف نے تدوین حدیث بالخصوص حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں قلم بند ہونے والے ذخیرہ حدیث کو وضاحت وصراحت سے بیان کیا ہے۔ مولف نے احادیث قلم بند کرنے والے صحابہ کرامؓ اور ان کی ۱۵۹۰۶ مرویات کا نقشہ بنا کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ مولف نے منکرین حدیث کے اس دعوے کو پاش پاش کر دیا ہے کہ احادیث، حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد مدون ہوئیں تھیں۔ علوم حدیث بالخصوص تدوین حدیث پر بعد میں لکھی جانے والی اکثر کتب میں مولفین نے تالیف ہذا کی تحقیق

کے حوالے نقل کیے ہیں۔ حجیت حدیث اور کتابت حدیث پر یہ نہایت بیش قیمت کتاب ہے۔

سنت خیر الانام

(پیر محمد کرم شاہ الازہری، لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۹۵۳ء، صفحات ۲۸۸)

حجیت حدیث کے موضوع پر پیر محمد کرم شاہ الازہری کی تالیف ہذا منفرد مقام کی حامل ہے۔ جس میں عالمانہ اور محققانہ انداز سے حجیت حدیث کے تفصیلی دلائل دیے گئے ہیں۔ باب اول میں اتباع سنت کے قرآنی دلائل اور سنت کی اہمیت کے مختلف پہلو، باب دوئم میں رسول بھیجنے کا مقصد، احادیث کی تدوین کے مختلف ادوار اور روایت حدیث میں احتیاط، باب سوم میں سنت کی تشریعی اہمیت، اقسام سنت اور خبر واحد پر اعتراضات کا علمی اور موثر جواب اور باب چہارم میں مختلف احادیث پر منکرین سنت کے اعتراضات کا رد قرآن وحدیث کے تفصیلی دلائل سے پیش کیا گیا ہے۔ مولف نے منکرین حدیث کے اعتراضات کے جواب میں جو عالمانہ اور فاضلانہ انداز اختیار کیا ہے وہ منفرد اور لاجواب ہے۔

ضرورت حدیث

(قاضی محمد زاہد الحسینی، ایبٹ آباد، مئی ۱۹۵۳ء، صفحات ۱۴۵)

منکرین حدیث قرآن مجید کی موجودگی میں حدیث کی ضرورت کے منکر ہیں۔ قاضی محمد زاہد الحسینی نے اس کتاب میں ضرورت حدیث کو خالص علمی اور عقلی انداز سے ثابت کرنے کی محققانہ اور عالمانہ کوشش کی ہے۔ مولف نے مقام رسولؐ، ایمان بالرسلؑ اور فرامین رسولؐ کی اہمیت واضح کرنے کے علاوہ حدیث کے دین میں حجت اور معتبر ہونے کے تفصیلی دلائل اور مختلف قرون میں کتابت حدیث کی علمی وتحقیقی تفصیل بیان کی ہے۔ اس تالیف میں انکار حدیث کے نتیجے میں ہونے والے مختلف نقصانات کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ منکرین حدیث کے بنیادی اعتراضات یعنی حضورؐ نے احادیث نہیں لکھوائیں بلکہ منع کیا، احادیث کا آپس میں سخت اختلاف ہے، حدیث ظنی ہے، اتنی کثرت سے حدیثیں کیوں ہیں، قرآن وحدیث میں تضاد ہے، کا رد بھی بسط وتفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ ضرورت حدیث اور حجیت حدیث پر یہ کتاب امتیازی مقام کی حامل ہے۔

برق اسلام بجواب رسالہ طلوع اسلام

(مولانا محمد شرف الدین، ملتان، مکتبہ سعیدیہ، مدرسہ فیض الاسلام،۱۹۵۳ء صفحات ۲۴۸)

منکر حدیث حافظ مولانا محمد اسلم جیراج پوری کا ایک مقالہ بہ عنوان ''علم حدیث'' رسالہ طلوع اسلام دہلی میں شائع ہوا۔جس میں حدیث کے بارے میں شبہات پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ۔ چنانچہ منکرین حدیث کے جملہ اعتراضات کا بالعموم اور اسلم جیراج پوری کے شبہات کا بالخصوص رد پیش کرنے کے لیے مولف نے استدلال کی پختگی سے اپنا موقف اس تالیف میں ثابت کیا ہے ۔ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے ۔جن میں کتابت حدیث ، وضع حدیث ، تنقید حدیث ، اصول حدیث ، دلائل حدیث ، قرآن و حدیث ، عقل اور حدیث اور رتبہ حدیث کے اہم عنوانات پر قلم آرائی کی گئی ہے ۔ان ابواب کے مندرجات سے حدیث کے مقام ، اہمیت اور حجیت پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے ۔انکار حدیث کے رد میں تفصیلی دلائل کی بناء پر یہ خاصی اہم ہے ۔

فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر

(افتخار احمد بلخی ، کراچی ، مکتبہ چراغ راہ ،۱۹۵۴ء ، صفحات اول ۲۴۰ ، دوئم ۴۰۸ ، سوئم ۵۸۲)

برصغیر میں فتنۂ انکار حدیث و سنت کی تاریخ اور پس منظر، منکرین حدیث کے اعتراضات وشبہات کے تفصیلی جائزہ اور فتنہ کے تدارک کے لیے علمی و عملی تدابیر کی تفاصیل پر مبنی افتخار احمد بلخی کی یہ اہم تصنیف تین باہم مربوط حصوں پر مشتمل ہے ۔ حصہ اول میں پس منظر کے عنوان کے تحت وراثتی نظام کی بنیاد پر قائم ہونے والی مختلف حکومتوں میں مختلف فتنوں کے ظہور کی جامع تفصیل بیان کرکے واضح کیا گیا ہے کہ برصغیر میں فتنۂ انکار سنت سے بہت پہلے حدیث کو مشکوک بنانے کے فتنے کا آغاز ہو چکا تھا۔اسی حصہ میں مولف نے منظر کے عنوان سے برصغیر ہند و پاک میں فتنۂ انکار حدیث کی تاریخ و تفصیل بھی بیان کی ہے ۔اس سلسلے میں سر سید احمد خان ، مولوی چراغ علی ، عبداللہ چکڑالوی اور احمد الدین امرت سری کی طرف سے حدیث کو مشکوک بنانے ، حدیث کا انکار کرنے اور من مانی تاویلات و تحریفات کرنے کی کوششوں کو مرحلہ وار بیان کیا ہے ۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں انکار حدیث کے سلسلے میں غلام احمد پرویز اور ادارہ طلوع اسلام کے نظریات اور عملی کوشش کی مکمل تصویر سامنے لائی گئی ہے ۔ضرورت کے مطابق جابجا پرویزی خرافات کا رد بھی مولف نے

پیش کیا ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں ادارہ طلوع اسلام کے ذوقِ دشنام طرازی، ملا اور ملائیت کی اصطلاحات کی آڑ میں دین دار طبقے اور اسلام اور شعائر اسلام کی توہین کی تفصیل لکھی گئی ہے۔ اس حصہ میں حجیت حدیث وسنت پر قرآن وحدیث، تاریخی شواہد اور عقلی ثبوت کی روشنی میں مدلل بحث کی گئی ہے۔ نیز مولف نے انکار سنت کی فتنے کی بیماری کی تشخیص کر کے اس کے علاج کی صورتیں اور حجیت حدیث پر کام کرنے کے پہلوؤں کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ برصغیر میں فتنہ انکار حدیث کے رد میں یہ تالیف ایک منفرد وممتاز مقام کی حامل ہونے کے علاوہ اس فتنہ کے مضمرات کو سمجھنے اور اس سے نمٹنے کے لیے علمی وعملی تدابیر وتجاویز پر مشتمل ایک اہم دستاویز بھی ہے۔

حدیث اور قرآن

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، کراچی، مکتبہ چراغ راہ، ۱۹۵۴ء، صفحات ۱۵۰)

ماہنامہ ترجمان القرآن حیدرآباد دکن انڈیا کے ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے مختلف شماروں میں انکار حدیث کے فتنہ کے رد میں مولانا مودودیؒ کے چند مضامین شائع ہوئے جنہیں ''حدیث اور قرآن'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ پہلا مضمون ''اتباع واطاعت رسولؐ'' کے عنوان سے مولانا اسلم جیراج پوری کی کتاب ''تعلیمات قرآن'' پر تنقید کے سلسلہ میں، دوسرا مضمون ''رسالت اور اس کے احکام'' کے موضوع پر غلام احمد پرویز کے نظریات پر مبنی ایک طویل مراسلہ کے جواب میں لکھا گیا ہے جب کہ تیسرے مضمون کا عنوان ''حدیث اور قرآن'' ہے۔ مضامین میں منکرین حدیث کے شبہات کی نفی، اتباع رسولؐ کو قرآن کی آیات سے ثابت کر کے کی گئی ہے۔ اللہ کی کتاب قرآن کے ساتھ رسالت کے نا قابل انقطاع رشتہ کو قرآن وسنت اور عقلی وتاریخی دلائل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب حدیث کی اہمیت سمجھنے کے لیے تحقیقی مواد سے مزین ہے۔

رسول اللہؐ اور سنت رسولؐ۔ قرآن اور عقل سلیم کی روشنی میں

(نعیم صدیقی، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۵۵ء، صفحات ۲۶۹)

اس کتاب میں چونکہ موضوع بحث سنت یا حدیث ہے اس لیے دلائل دینے میں مولف نے قرآنی آیات کو سرچشمہ استدلال بنایا ہے۔ سنت رسولؐ کی شرعی اہمیت پر اوائل سے امت کے اجماع کی بنیادی دلیل کے علاوہ قرآنی آیات اور عقل انسانی کی روشنی میں ٹھوس دلائل پیش کیے

گئے ہیں نیز انکار سنت کے فتنے کا پس منظر بھی پیش کیا گیا ہے۔مولف نے خدا کی طرف سے دی گئی رسولؐ کی اتھارٹی پر دلائل دے کر ثابت کیا ہے کہ خدا کی اطاعت کا انحصار نبیؐ کی اطاعت پر ہے۔ کتاب اور رسولؐ کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے مولف نے انسانی زندگی میں دعوتی کام کے لیے فکر اور عمل دونوں کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ کتابی دعوت کے ساتھ ساتھ داعی کا ہونا بھی ضروری ہے۔تبیین کتاب کے چار شعبوں یعنی تلاوت آیات ، تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت پر سیر حاصل بحث کرکے ضرورت نبوتؐ وحجیت حدیث کی اہمیت بیان کی ہے۔خالص علمی مباحث پر مشتمل یہ کتاب پڑھے لکھے اور باشعور طبقے کی رہنمائی اور منکرین حدیث کے دلائل کی نفی اور رد کے لیے انتہائی موثر کوشش ہے۔

بصائر السنہ

(محمد امین الحق قادری، شیخوپورہ، ج اول ۱۹۵۵ء، ج دوم ۱۹۵۷ء، صفحات اول ۲۹۵، صفحات دوم ۳۳۲)

بصائر السنہ حدیث رسولؐ پر معترضین کے اعتراضات وشبہات کے جواب اور حدیث کے مقام حقیقی کو واضح کرنے کے لیے دو جلدوں پر مشتمل فاضل مولف کی ایک جامع اور اہم تصنیف ہے۔جلد اول میں فتنہ انکار حدیث کے آغاز ، اسباب ، حجیت حدیث ، قرآن وحدیث کے باہمی ربط ، تدوین حدیث ، فتنہ وضع حدیث ، خبر واحد کی حجیت ، محدثین کرام کے حالات زندگی ، منکرین حدیث کے اعتراضات وشبہات اور ان کے جوابات کے عنوانات پر تفصیلی بحث موجود ہے۔جلد دوم میں غلام احمد پرویز کے اس دعوے کی تردید کے تفصیلی دلائل موجود ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ، شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ منکرین حدیث تھے۔تالیف ہذا میں حجیت حدیث کو ثابت کرنے کے لیے حتی المقدور کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا گیا۔ہر پہلو پر مدلل بحث کی گئی ہے۔قرآن پاک سے استدلال کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نبیؐ ہمہ وقت نبیؐ اور اس کا ہر کلام وحی ہے۔تاریخ اسلام، عقلی ونقلی دلائل، آثار و قرائن اور منطقی استدلال سے بھی مسئلہ سمجھانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔فتنہ انکار حدیث کے رد اور حجیت حدیث کے مدلل مواد پر مشتمل یہ تالیف انتہائی موثر اور جامع کتاب ہے۔

تدوین حدیث

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی، کراچی، مکتبہ اسحاقیہ، ۱۹۵۶ء، صفحات ۴۷۹)

اس تصنیف میں فاضل جلیل مولف نے جن مباحث پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ان سے نہ

صرف ضرورت حدیث، مقام حدیث اور تدوین حدیث کے بارے میں جامع اور مستند معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ انکار حدیث کا سبب جو شکوک و شبہات بنتے ہیں ان کا بھی کما حقہ تدارک ہوجاتا ہے۔ کتاب میں حدیث کی حقیقت، عام تاریخی ذخیروں سے فن حدیث کے امتیازات حدیث کی کتابی تدوین، تدوین حدیث کا ماحول، عہد صحابہؓ اور مرتبین صحاح کے درمیانی دور میں حفاظت حدیث کی شکلیں، تاریخ تدوین حدیث، حجیت حدیث کے قرآنی دلائل کے علاوہ موضوع سے متعلق دیگر اہم عناوین پر عالمانہ اور محققانہ انداز میں حالات و واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ خصوصاً تاریخ تدوین حدیث کے مباحث، منکرین حدیث کے اس دعوے کا مکمل رد پیش کرتے ہیں کہ احادیث، حضورؐ کے دوڈھائی سو سال بعد مرتب کی گئیں، یہ تالیف حجیت حدیث کے ادب میں قیمتی اثاثہ ہے۔

قرآنی تعزیرات بجواب پرویزی خرافات

(منور حسین سیف الاسلام دہلوی، لاہور، ادارہ فلاح دارین، اپریل ۱۹۵۷ء، صفحات ۴۱۶)

فتنہ پرویزیت کے رد میں اہم کوشش پر مبنی یہ تالیف تفصیلی مواد کی حامل ہے۔ جس میں پرویز کی، حدیث کے ساتھ قرآن کی مخالفت کو بھی ثابت کیا گیا ہے۔ محمد رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی پر پرویز کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ جب کہ اسلاف پر پرویز کے حملوں کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے۔ احادیث کی عظمت اور کتب حدیث کے مقام کو واضح کرنے کے علاوہ وحی غیر متلو کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ پرویز کے مختلف عقائد باطلہ کی حقیقت کا بیان اور ان کی محققانہ تردید مولف کی محنت کی عکاس ہے۔

فتنہ انکار حدیث

(علامہ حافظ محمد ایوب دہلوی، کراچی، مکتبہ رازی، ۱۹۵۸ء، صفحات ۹۳)

منکرین حدیث بالخصوص ادارہ طلوع اسلام کے پیش کردہ نظریات باطلہ کے رد میں علامہ محمد ایوب دہلوی نے حجیت حدیث کے دلائل کو تفصیل کے ساتھ تالیف ہذا میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے منکرین حدیث کی ایک ایک دلیل کو لے کر اس پر خوب جرح کی ہے۔ اس کی اہم خوبی یہ ہے کہ علامہ موصوف نے حدیث رسولؐ کے دین میں حجت ہونے، احادیث رسولؐ کے موجودہ

مجموعہ کے یقینی اور ظن شرعی کے حجت ہونے اور احادیث رسولؐ کے واجب العمل ہونے کو قرآنی دلائل سے ثابت کیا ہے۔منکرین حدیث کے مختلف شبہات واعتراضات کا بھی محققانہ اور تسلی بخش جواب دیا ہے۔منکرین حدیث نے اپنی مطلب براری کے لیے قرآن مجید کی مختلف آیات کے جو غلط تراجم پیش کیے ہیں،ان کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔حجیت حدیث کے ادب میں یہ اہم مقام اور وزن رکھتی ہے۔تالیف کے عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

قول فیصل

(ماہرالقادری،لاہور،شعبہ تبلیغ واشاعت مدرسہ اسلامیہ گلبرگ،۱۹۶۰ء،صفحات ۷۹)

یہ تالیف دراصل مولف کے زیرادارت جریدہ ماہنامہ ''فاران'' کراچی کی دواشاعتوں میں مولف کے شائع ہونے والے مضامین کی کتابی شکل ہے۔اس مختصر مگر جامع کتاب میں غلام احمد پرویز کے نظریات باطلہ کی تفصیل اور ان کا رد محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کتاب میں انکار حدیث کے فتنے کے مضمرات ونتائج پر سیر حاصل علمی بحث کی گئی ہے۔نیز سنت رسولؐ کی حجت کو کتاب اللہ اور عقل کی روشنی میں خالص علمی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

سنت قرآن حکیم کی روشنی میں

(مولانا عبدالغفار حسن،فیصل آباد،جامعہ تعلیمات اسلامیہ،اگست ۱۹۶۱ء،صفحات ۴۰)

مولانا عبدالغفار حسن کا منکرین حدیث کے دلائل کے رد میں ایک مقالہ جو ۱۹۵۵ء میں رسالہ ترجمان القرآن لاہور اور مقام رسالت کراچی میں شائع ہوا تھا اس کو ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔منکرین حدیث کا یہ دعویٰ کہ حدیث پرکھنے کا معیار قرآن ہے اس کی موثر تردید کی گئی ہے۔اس علمی مقالہ میں تین اہم امور کی جانب توجہ دلا کر حجیت حدیث کو ثابت کیا گیا ہے ایک یہ کہ خود قرآن سے اس امر کا ثبوت کہ قرآنی آیات کے علاوہ نبیؐ پر وحی کا نزول ہوا کرتا تھا۔دوسرے رسول اللہؐ کے ارشادات اور سیرت طیبہ کے ماخذ شریعت اور مدار نجات ہونے پر قرآن حکیم کی محکم شہادتیں،تیسرے یہ کہ ان آیات کی صحیح تفسیر وتاویل جن کو سنت کے انکار کے سلسلے میں بطور حجت پیش کیا جاتا ہے۔مقالہ مختصر مگر تحقیقی مواد کا حامل ہے۔

ضرب حدیث

(مولانا محمد صادق سیال کوٹی، سیال کوٹ، مکتبہ کتاب وسنت، مئی ۱۹۶۱ء، صفحات ۴۰۸)

مشہور منکرین حدیث عبداللہ چکڑالوی اور غلام احمد پرویز کی خرافات کے جواب میں محمد صادق سیال کوٹی نے قرآنی استدلال اور احادیث رسولؐ کے حوالوں سے فتنہ انکار حدیث کا رد کر کے حضورؐ کی سنت کو وحی، حجت، ماخذ دین اور قرآن کی تبیین ثابت کی ہے۔ عبداللہ چکڑالوی کے عقائد باطلہ کے بارے میں مختصراً اور غلام احمد پرویز کے شبہات کا تفصیلی جواب کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ پرویز کے مختلف نظریات مثلاً مرکز ملت کی اطاعت، اقامت صلوٰۃ کا مفہوم، زکوٰۃ کا تصور اور قربانی وحج کے بارے میں بے بنیاد اور من گھڑت دعوؤں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں غلط ثابت کیا گیا ہے، نیز حجیت حدیث، حفاظت حدیث، تدوین حدیث اور مقام سنت کے عنوانات پر سیر حاصل اور پر مغز بحث کی گئی ہے۔ دلائل کے اعتبار سے یہ منکرین حدیث کے لیے واقعی کاری ضرب ہے۔

تاریخ تدوین حدیث

(ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، کراچی، پاک اکیڈمی، مئی ۱۹۶۲ء، صفحات ۱۷۴)

دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام جولائی ۱۹۳۸ء میں علمائے محققین کے خصوصی اجتماع میں ڈاکٹر محمد زبیر کی چند سال کی سعی وجہد سے تاریخ تدوین حدیث پر پیش کیے گئے مقالے کی کتابی شکل ''تاریخ تدوین حدیث'' کے نام سے ہے۔ اس میں مولف نے علم حدیث کے بلند مقام اور حدیث کی اہمیت وحقانیت کو واضح کیا ہے۔ کتابت حدیث کے بارے میں مستشرقین اور برصغیر کے منکرین حدیث کے شبہات واعتراضات کی وجہ سے کتابت حدیث کو حضورؐ کے دور ہی سے ثابت کیا ہے۔ نیز عہد نبویؐ کے بعد کے تحریری سرمایہ حدیث کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ کتاب میں حجیت حدیث پر دلائل کے علاوہ منکرین حدیث کے مغالطّوں کا رد بھی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب منفرد انداز تحریر، تحقیقی طرز بیان اور جامعیت موضوع کی خوبیوں سے مزین ہے۔

سنت کی آئینی حیثیت

(مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، ۱۹۶۳ء، صفحات ۳۹۲)

زیر نظر تالیف رسالہ ترجمان القرآن لاہور کے ''منصب رسالتؐ نمبر(ستمبر ۱۹۶۱ء) میں چھپنے والے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں مولانا مودودیؒ نے منصب نبوت پر مستند دلائل کے علاوہ ڈاکٹر عبدالودود کی طرف سے خطوط میں سنت رسولؐ کے بارے میں پیش کیے گئے شبہات و اعتراضات کے جواب میں سنت کی شرعی حیثیت پر تحقیقی بحث کی ہے اور اعتراضات کا انتہائی مدلل جواب دیا ہے۔ اس کی یہ انفرادیت ہے کہ حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کے قریباً تمام شبہات اور اعتراضات کا علمی و تحقیقی جواب اس تالیف میں موجود ہے۔ منکرین حدیث کے مختلف شبہات کے رد اور حجیت حدیث پر زوردار دلائل کی وجہ سے یہ حجیت حدیث کے لٹریچر میں ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

انکار حدیث۔ایک فتنہ ایک سازش

(پروفیسر محمد فرمان، گجرات، مکتبہ مجددیہ نور پور شرقی، ۱۹۶۴ء، صفحات ۲۱۴)

مولف نے مختلف منکرین حدیث مثلاً نیاز فتح پوری، غلام احمد پرویز، حافظ محبّ الحق، تمنا عمادی، مقبول احمد اور مولانا اسلم جیراج پوری کی مختلف تحریروں سے ہی ان کے موقف کو جھٹلایا ہے اور دلائل سے واضح کیا ہے کہ احادیث سے بے نیاز ہو کر آیات قرآنی کا مفہوم سمجھنا محال ہے۔ یہ فتنہ انکار حدیث کے رد میں جامع اور موثر مواد کی حامل ہے۔

صحیح مقام حدیث

(علامہ فضل احمد غزنوی، لاہور، مکتبہ سبحانی، ۱۹۶۶ء، صفحات اول ۳۲۸، صفحات دوم ۲۴۵)

غلام احمد پرویز اور دیگر منکرین حدیث کے مبنی بر انکار حدیث پر مضامین پر مشتمل کتاب ''مقام حدیث'' کے جواب میں ''صحیح مقام حدیث'' کے عنوان سے حجیت حدیث پر قرآن پاک کے دلائل اور احادیث نبویہؐ کے حوالوں سے علامہ فضل احمد نے دو حصوں پر مشتمل یہ مدلل تالیف پیش کی ہے۔''مقام حدیث'' میں پیش کیے گئے شبہات کی ترتیب کے مطابق سب کا مسکت جواب مولف موصوف نے پیش کیا ہے۔ مولف نے ''حدیث کی صحیح حیثیت'' کے عنوان سے پرویز کے قریباً تمام شبہات وخرافات کے جواب میں قرآن مجید کی آیات سے حدیث کے وحی، حجت اور ماخذ شریعت ہونے پر ایک سو انیس دلائل پیش کیے ہیں۔

صیانۃ الحدیث

(عبدالرؤف رحمانی، جھنڈانگری، ہندوستان، لکھنؤ، جون ۱۹۶۶ء، صفحات ۳۲۸)

یہ کتاب منکرین حدیث کے اعتراضات وشبہات میں سے ایک عام اعتراض یعنی احادیث حضورؐ کے ڈھائی تین سوسال بعد لکھی گئیں کی تردید کے اہم دلائل پر مشتمل ہے۔اس میں جامعیت کے ساتھ حجیت حدیث کے دلائل اور منکرین حدیث کے شبہات کا ردپیش کیا گیا ہے۔ جب کہ کتاب کا بیشتر حصہ حدیث کی جمع وتدوین وحفاظت کی تفاصیل پر مشتمل ہے۔جس میں حضور اکرمؐ اور صحابہؓ کے ادوار میں تدوین حدیث کی مفصل و مدلل تاریخ بیان کی گئی ہے تاکہ منکرین حدیث کی پیدا کردہ یہ تشکیک کہ احادیث حضورؐ کے ڈھائی تین سوسال بعد لکھی گئیں، کی تحقیقی انداز میں نفی ہوجائے۔موضوع کے بارے میں ایک اہم تصنیف ہے۔مندرجات میں جامعیت، گرفت میں قوت اور نقد وجرح میں متانت وسنجیدگی موجود ہے۔

حدیث رسولؐ کا قرآنی معیار

(قاری محمد طیب، لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۹۷۷ء، صفحات ۱۲۴)

اس تالیف کے مرتب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علم حدیث کی اہمیت اور عظمت کا قرآن مجید سے محققانہ ثبوت پیش کیا جائے۔چنانچہ اس مختصر تالیف میں اقسام حدیث، کتاب وسنت کے ربط، فہم حدیث کے بغیر فہم قرآن ممکن نہیں، حدیث بحیثیت حجت مستقل، قرآن اور فقہ کے ساتھ حدیث کا ربط اور حدیث کی حفاظت کے مختلف ادوار، کے موضوعات پر ایسی جامع اور عالمانہ بحث کی گئی ہے جس سے منکرین حدیث کے مختلف دعووں کی تردید ہوجاتی ہے۔

انکار حدیث، حق یا باطل

(مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، انڈیا، مرکزی دارالعلوم، وارانسی یوپی، مئی ۱۹۷۸ء، صفحات ۱۲۰)

وسط ہند کے اضلاع سیونی و بالاگھاٹ اور کئی دوسرے علاقوں میں انکار حدیث کے شبہات کے ازالہ کے لیے مصنف نے زیر نظر کتاب ترتیب دی۔اس میں جن اہم نکات پر بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں: کیا قرآن میں سب کچھ ہے، کیا حدیث کی ضرورت نہیں، انکار حدیث کے اصولی دلائل اور ان کا جواب، روایات کی تفصیل، اطاعت رسولؐ، منصب رسالت، عذاب قبر اور

نماز پنج گانہ کی تفصیل ۔اس طرح منکرین حدیث کے اہم شبہات کا احاطہ کر کے ان کا علمی و تحقیقی ابطال کیا گیا ہے۔

حفاظت وحجیت حدیث

(مولانا محمد محترم فہیم عثمانی، لاہور، دارالکتب، ۱۹۷۹ء، صفحات ۵۹۲)

یہ دو حصوں میں منقسم ہے ۔ پہلے حصے میں حفاظت حدیث اور دوسرے حصے میں حجیت حدیث پر بحث کی گئی ہے اور انکار حدیث کے اسباب کو بیان کر کے حفاظت حدیث کے طریقوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے ۔قرآن فہمی کے لیے حدیث کی ضرورت واہمیت کو بھی بیان کیا گیا ہے ۔ نیز منکرین حدیث کے اعتراضات اور دلائل کو بیان کر کے حدیث کی تشریعی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے ۔ اپنے موضوع پر علمی انداز اور پرزور دلائل کی بنیاد پر حجیت حدیث کی کتابوں میں یہ بلند مقام اور درجہ کی حامل ہے۔

سنت نبویہ ؐ اور قرآن کریم

(محمد حبیب اللہ مختار، کراچی، مجلس دعوت وتحقیق اسلامی، ۱۹۸۰ء، صفحات ۲۶۰)

یہ حجیت حدیث کے موضوع پر انتہائی مدلل اور اہم کتاب ہے جس میں فتنہ انکار حدیث کی تاریخ ،منکرین حدیث کے اغراض ومقاصد اور منکرین کے اعتراضات کی نوعیت کو وضاحت سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید ، احادیث اور تاریخی شواہد سے حدیث اور حجیت حدیث پر عالمانہ بحث کی گئی ہے ۔ نیز حضور اکرم ؐ کی بعثت کے مقاصد اور آپ ؐ کی اطاعت کے دلائل بھی بیان کیے گئے ہیں ۔اور حدیث کی ضرورت کے بارے میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

حجیت حدیث

(مولانا محمد اسماعیل سلفی ،لاہور، اسلامک پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء، صفحات ۲۰۲)

منکرین حدیث کے اعتراضات کے رد میں مولانا محمد اسماعیل سلفی کی یہ تالیف چار بڑے بڑے ابواب پر مشتمل ہے ۔ جن میں حدیث کی تشریعی اہمیت کو دلائل سے بیان کر کے منکرین حدیث کے شکوک وشبہات کو رفع کیا گیا ہے ۔احادیث کے متعلق منکرین حدیث کا یہ نظریہ کہ وہ ظنی ہیں، کا موثر رد پیش کیا گیا ہے ۔فتنہ انکار حدیث کی تاریخ اور اسباب تفصیلاً بیان کیے گئے ہیں ۔

فاضل مصنف نے ''سنت قرآن کے آئینے میں'' اور ''حجیت حدیث آنحضرتؐ کی سیرت کی روشنی میں'' کے عنوانات کے تحت حجیت حدیث کے تفصیلی دلائل پیش کیے ہیں۔ حجیت حدیث کے عنوان پر اس کتاب کی اہمیت مسلمہ ہے۔

فتنۂ انکار حدیث

(مفتی رشید احمد، کراچی، کتب خانہ مظہری، ۱۹۸۲ء، صفحات ۲۷)

غلام احمد پرویز و دیگر منکرین حدیث کے انکار حدیث کے سلسلے میں شبہات کے رد میں اس میں مدلل بحث کی گئی ہے اور منکرین حدیث کو پرزور جواب دیا گیا ہے۔ دلائل ایسے انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ کوئی طالب حق، منکرین حدیث کے فریب میں نہ آسکے۔ منکرین حدیث کے نظریات کے رد کے لیے قرآن وحدیث کے علاوہ عقلی دلائل کو بھی بروئے کار لایا گیا ہے۔ یہ حجیت حدیث کے لٹریچر میں مختصر مگر موثر مواد کی حامل ہے۔

انکار حدیث کے نتائج

(مولانا محمد سرفراز صفدر، گوجرانوالہ، انجمن اسلامیہ، ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۷۸)

تالیف ہٰذا میں مولانا سرفراز صفدر نے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلوؤں پر مفصل بحث کی ہے اور منکرین حدیث کے مختلف شبہات پیش کر کے ان کا رد پیش کیا ہے۔ منکرین حدیث کے شبہات، اعتراضات اور ان کے عقائد و اعمال ان کی اصل تحریروں کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔ جن منکرین حدیث کے اعتقادات کا رد پیش کیا گیا ہے ان میں عبداللہ چکڑالوی، مولانا اسلم جیراج پوری، نیاز فتح پوری اور غلام احمد پرویز قابل ذکر ہیں۔ انتہائی مدلل اور موثر کتاب ہے۔

عظیم فتنہ

(مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی، کراچی iii۔ ایچ ۱۲/۲۰، ناظم آباد، ۱۹۸۴ء، صفحات ۲۷)

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں مفتی ولی حسن ٹونکی کی فتنۂ انکار حدیث کے سلسلے میں ایک جامع اور مدلل تقریر کی کتابی شکل ہے۔ جس میں حدیث کی اہمیت و حجیت بیان کرنے کے علاوہ حدیث کے خلاف اٹھنے والی مختلف سازشوں مثلاً فتنۂ وضع حدیث، فتنۂ انکار حدیث اور حدیث کے خلاف مستشرقین اور نیچریت کے فتنوں کا جامع تذکرہ موجود ہے اور

خصوصیت سے فتنہ پرویزیت کے رد میں مدلل بحث کی گئی ہے۔فتنہ انکار حدیث کے رد میں عمدہ تصنیف ہے۔

مقدمہ تاریخ تدوین حدیث

(مولف ڈاکٹر فواد سزگین، مترجم سعید احمد، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ستمبر ۱۹۸۵ء، صفحات ۸۹)

ادارہ تحقیقات اسلامی کے شعبہ دعوت وارشاد نے تاریخ تدوین حدیث کے بارے میں تعلیم یافتہ طبقے میں پائی جانے والی غلط فہمی اور اس غلط فہمی کی بنیاد پر حدیث کی حجیت کو شک و شبہ میں ڈالنے کی کوشش کے رد کے لیے ترک پروفیسر فواد سزگین کی مشہور تالیف ''تاریخ علوم عربیہ'' کے مقدمہ کے ترجمے کا اہتمام کیا ہے۔اس مقدمہ میں حدیث اور تاریخ تدوین حدیث کے بارے میں مشہور مستشرق (GOLDZIHER) کے اعتراضات کا مدلل تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور کتابت حدیث کے بارے میں غلط فہمیوں کے اسباب کی نشان دہی کر کے ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔مقدمہ کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انتہائی مدلل حوالہ جات سے تدوین حدیث کے موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے۔یہ ترجمہ تعلیم یافتہ طبقہ اور عام قارئین کے لیے از حد مفید ہونے کے علاوہ ہندوپاک کے منکرین حدیث کے شبہات کی مدلل تردید ہے۔

آثار الحدیث

(ڈاکٹر خالد محمود، لاہور، دار المعارف جلد اول ۱۹۸۵ء،
جلد دوم ۱۹۸۸ء، صفحات اول ۴۶۴، صفحات دوم ۴۷۲)

مستشرقین کی طرف سے حدیث کو مشکوک بنانے اور برصغیر میں منکرین حدیث کے فتنے کے سدباب کے لیے فاضل مولف کی یہ علمی کاوش دو جلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی جلد میں تاریخ حدیث، ضرورت حدیث، مقام حدیث، حجیت حدیث، حفاظت حدیث، تدوین حدیث اور حدیث سے متعلق اہم موضوعات پر علمی بحث کی گئی ہے۔دوسری جلد میں آداب الحدیث، قواعد حدیث، اقسام حدیث، متون حدیث، تراجم حدیث، ائمہ حدیث، منکرین حدیث اور دیگر اہم عناوین پر تحقیقی و علمی کام کیا گیا ہے۔حدیث اور اس کے متعلقات کے بارے میں تفصیلی مواد کی حامل تالیف ہونے کے باعث منکرین حدیث کے اہم اعتراضات وشبہات کا جواب کتاب

کے مختلف ابواب میں پایا جاتا ہے۔تاہم خصوصیت سے حجیت حدیث کے باب میں قرآنی آیات کے حوالے سے تشریحی اور وضاحتی دلائل دیے گئے ہیں۔

فتنۂ انکار حدیث اور اس کا پس منظر

(مفتی محمد عاشق الٰہی، لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۹۸۶ء، صفحات ۴۸)

فتنۂ انکار حدیث کے پھیلنے اور عام لوگوں پر اس کے اثرات کے اندیشہ کے پیش نظر تالیف ہذا میں منکرین حدیث کے عزائم اور ان کے عقائد بیان کرکے ان کی نفی کی گئی ہے۔ منکرین حدیث چونکہ حدیث کو نہیں مانتے لہٰذا ان کے دعوؤں کی قرآن مجید سے تردید پیش کی گئی ہے۔منکرین کے کتابت حدیث پر اعتراضات کے رد کے لیے اس میں کتابت حدیث پر جامع بحث کی گئی ہے۔یہ فتنۂ انکار حدیث کے رد میں موثر کاوش ہے۔

آئینہ پرویزیت

(مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، لاہور، مکتبۃ السلام، اکتوبر ۱۹۸۷ء، صفحات ۹۸۴)

حجیت حدیث اور رد انکار حدیث کے موضوعات پر مولانا عبدالرحمٰن کیلانی کی یہ کتاب اپنے مضبوط دلائل، تاریخی حقائق کی تفصیل اور عمدہ اسلوب بیان کی وجہ سے ایک نہایت اہم تالیف ہے۔ چھ حصوں پر مشتمل اس ضخیم کتاب کا پہلا حصہ معتزلہ سے طلوع اسلام تک انکار حدیث کی تاریخ اور دوسرا حصہ طلوع اسلام کے نظریات کے رد پر مشتمل ہے۔تیسرے حصہ کا عنوان قرآنی مسائل ہے۔ چوتھا حصہ دوام حدیث اور پانچواں حصہ دفاع حدیث کے نام سے ہے۔ جبکہ چھٹے حصے کا عنوان ''طلوع اسلام کا اسلام'' ہے۔اس میں منکرین حدیث کے نظریات کی خوب بیخ کنی کی گئی ہے۔انکار حدیث کے فتنہ کی تاریخ، منکرین حدیث کے افکار و خیالات اور ان کے طریقہ کار کی تفصیلات بیان کرنے کے علاوہ مولانا اسلم جیراج پوری اور غلام احمد پرویز کے حدیث کے بارے میں شبہات کا محققانہ رد پیش کرنے میں یہ کتاب منفرد مقام کی حامل اور ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

عظمت حدیث

(مولانا عبدالغفار حسن رحمانی، اسلام آباد، دارالعلم، ۱۹۸۹ء، صفحات ۴۴۴)

یہ مولف کتاب کے علاوہ مولانا عبدالجبار عمر پوری، مولانا عبدالستار حسن عمر پوری اور

مولانا صہیب حسن کے حدیث کے بارے میں چار علمی مقالات کا مجموعہ ہے جن میں حدیث اور علم حدیث کا تعارف تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔حدیث کی تدوین وحفاظت پر جامع بحث کی گئی ہے۔ حدیث کی اسلام میں حجت اور استنادی حیثیت دلائل سے بیان کی گئی ہے۔منکرین حدیث کے حدیث کے بارے میں پیش کردہ شکوک وشبہات اور مغالطّوں کا عالمانہ اور محققانہ رد پیش کیا گیا ہے۔حدیث کے بارے میں مقالات کا یہ مجموعہ حجیت حدیث کے ادب میں نہایت اہم ہے۔

حجیت حدیث

(مولانا محمد تقی عثمانی، لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۹۹۱ء، صفحات ۱۶۸)

اکتوبر ۱۹۸۹ء میں شکاگو امریکہ میں پیش کیے گئے حجیت حدیث کے موضوع پر مولانا محمد تقی عثمانی کے مقالے (The Authority of Sunnah) کا اردو ترجمہ زیر نظر تالیف کی صورت میں مرتب کیا گیا ہے۔حجیت حدیث پر اس علمی وتحقیقی تالیف میں سنت کی تعریف، مقام، رسولؐ کی اطاعت اور اتباع کی اہمیت، وحی اور اس کی اقسام نیز حجیت رسالت پر تفصیلی دلائل دیے گئے ہیں۔مزید برآں حدیث کی تدوین کی تاریخ جامع انداز میں پیش کی گئی ہے۔حدیث کے بارے میں بنیادی نوعیت کے سوالات کے جواب بھی موجود ہیں اور سنت کے بارے میں مغالطّوں کا تسلی بخش جواب بھی ہے۔

علم الحدیث

(عبداللہ العمادی، ہندوستان، حیدرآباد (اے پی) مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ، صفحات ۱۱۲)

زیر نظر تحقیقی تالیف ہندوستان میں انکار حدیث کے فتنہ سے مسلمانوں کو متاثر ہونے سے بچانے کے لیے مولف کی ایک اہم سعی ہے۔اس میں حدیث کی مختلف کتب کی تالیف کی تفصیل بیان کرنے کا سبب اس تاثر کو رد کرنا ہے کہ حدیثیں حضورؐ کے بعد لکھی گئیں۔کتاب میں اصول حدیث، درایت کی اہمیت کے علاوہ حدیث کی اہمیت منوانے کے لیے اس کے اجتماعی اور عمرانی فوائد ذکر کیے گئے ہیں۔اور بعض حدیثوں کے موضوع ہونے کے بارے میں شبہات کے جواب کے لیے شرعی دلائل کے علاوہ عقلی انداز سے بات کو سمجھایا گیا ہے۔زیر نظر موضوع پر علمی و تحقیقی دلائل کی بناء پر یہ بڑی افادیت کی حامل ہے۔

حجیت حدیث

(مولانا محمد ادریس کاندھلوی، لاہور، صفحات ۱۸۴)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اپنی اس اہم تالیف کے آغاز میں انکار حدیث کے فتنے کے مضمرات اور انکار حدیث کی وجہ بتلانے کے علاوہ علمی و تحقیقی انداز سے قرآن مجید کی آیات کے استدلال سے حجیت حدیث پر پندرہ اہم دلائل بیان کیے ہیں۔ مولانا موصوف نے قرآن مجید سے ماخوذ دلائل اس لیے بیان کیے کہ منکرین حدیث صرف قرآن کے ماننے کے دعوے دار ہیں، منکرین حدیث کے سات بڑے بڑے شبہات کا عالمانہ ومحققانہ رد بھی میں پیش کیا گیا ہے جو حدیث کے بارے میں شکوک وشبہات رکھنے والوں کے علاوہ انکار حدیث کے مرتکب لوگوں کو حدیث کے حجت شرعی ہونے کا قائل کرنے کے لیے نہایت اہم ہیں۔

حجیت حدیث

(مولانا سید محمد بدر عالم، لاہور، صفحات ۱۲۸)

مولانا سید محمد بدر عالم کی عظیم تالیف ''ترجمان السنہ'' کا ایک باب جو حجیت حدیث پر تفصیلی دلائل کا حامل ہے علاحدہ کتابی صورت میں ''حجیت حدیث'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ انکار حدیث کے رد میں مولانا موصوف کی یہ کاوش نہایت اہم مقام کی حامل ہے۔ مختلف منکرین حدیث بالخصوص مولانا اسلم جیراج پوری کے نظریات کا توڑ اور رد مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز حدیث رسولؐ کی حجت وزنی دلائل سے ثابت کی گئی ہے۔

حدیث کی تدوین عہد صحابہؓ اور تابعین میں

(حکیم عبدالشکور معاون اڈیٹر اخبار ''اہل حدیث'' دہلی، ملتان، فاروقی کتب خانہ، صفحات ۴۸)

زیر نظر تالیف ''کتابت حدیث پر منکرین حدیث کی تاریخی غلط بیانی'' کے عنوان سے جریدہ اہل حدیث دہلی کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہونے والے تحریروں کی کتابی شکل ہے۔ مولف نے حدیث کی تدوین اور کتابت کو قرآن پاک، احادیث، اقوال صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین اور مورخین اسلام کی تحریروں کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ کتاب میں منکرین حدیث کے مشہور اعتراضات حسبنا کتاب الله ، لا تکتبوا عنی غیر القرآن اور یہ کہ کتابت وتدوین حدیث

حضورؐ کے بعد ہوئی کا مدلل، سنجیدہ اور مسکت جواب دیا گیا ہے۔ خالص علمی انداز میں دیے گئے دلائل منکرین حدیث کے دعووں کا توڑ اور ان کے لیے چیلنج ہیں۔

مقام حدیث مع ازالہ شبہات

(فیض احمد ککروی، ملتان، مکتبہ امدادیہ، صفحات ۱۲۰)

انکار حدیث کے فتنے کے رد اور حجیت حدیث پر خالص علمی انداز کی اس تالیف میں علم حدیث کا تعارف، تاریخ حدیث، کتابت حدیث، حدیث نبویؐ کی ضرورت، حجیت حدیث اور تعداد حدیث کے عنوانات پر مدلل اور علمی بحث کی گئی ہے اگرچہ ان عنوانات پر جامع بحث از خود ہی منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ ہے تاہم علاحدہ ایک باب میں منکرین حدیث کے قریباً تمام شبہات کا علاحدہ علاحدہ رد اور علمی و تحقیقی جواب پیش کیا گیا ہے۔ مقام حدیث اور حجیت حدیث پر مولف کی یہ کاوش بصیرت افروز دستاویز ہے۔

جواہر مضیہ رد نیچریہ

(فقیر غلام دستگیر ہاشمی صدیقی، لاہور، صفحات ۹۲)

اس رسالے کے لکھنے کا سبب سرسید احمد خان کے وہ خیالات و اعتقادات ہیں جو انھوں نے پرچہ تہذیب الاخلاق بابت ۱۵؍ربیع الاول ۱۲۹۰ھ میں حدیث صحیح من تشبہ بقوم فھو منھم کے بارے میں پیش کیے ہیں اور شعائر میں کفار کی ہر قسم کی مشابہت کو روا رکھا ہے۔ صحیح حدیث کے انکار کے علاوہ سرسید کے دیگر اعتقادات، قرآن و حدیث کے واضح احکام کے انکار اور ان کی مبنی بر رائے تاویل کے رد میں اس میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اسلام اور عقلیات

(مولانا اشرف علی تھانویؒ، لاہور، ادارہ اشرفیہ)

اس کتاب کے حصہ دوم میں مولانا اشرف علی تھانوی نے دیگر موضوعات کے علاوہ فتنہ انکار حدیث پر بھی جامع بحث کی ہے۔ جس میں انکار حدیث کے اسباب کے ساتھ ساتھ منکرین حدیث کے انکار حدیث کے متعلق دلائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مولف نے منکرین حدیث کے تمام مشہور شبہات و اعتراضات کا علاحدہ علاحدہ رد پیش کیا ہے اور منکرین حدیث کے استدلال

کو جھوٹ اور لغو ثابت کیا ہے۔ مزید برآں حضورؐ کی پیغمبرانہ حیثیت اور حدیث کی اہمیت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ فتنۂ انکار حدیث کے رد میں مولانا موصوف کی یہ کاوش ایک اہم علمی اضافہ ہے۔ (باقی)

حواشی

(۱) ابن حزم، امام، ابو محمد علی بن احمد، الاحکام فی اصول الاحکام، مصر، مکتبہ الخانجی شارع عبدالعزیز، ۱۹۲۰ء، ج ۱، ص ۱۱۴۔ (۲) ندوی، محمد حنیف، مسئلہ اجتہاد، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۵۲ء، ص ۵۹۔ (۳) اس سلسلے میں مولانا ثناء اللہ امرت سری، مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی آراء قابل ذکر ہیں، دیکھیے: ۱- امرت سری، ثناء اللہ، مولانا، حجیت حدیث اور اتباع رسولؐ، ہندوستان، امرت سر کتب خانہ ثنائیہ، ۱۹۲۹، ص ۱۔ ۲- عثمانی، محمد تقی، مولانا، درس ترمذی، کراچی، مکتبہ دارالعلم کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۲۶۔ ۳- مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا، سنت کی آئینی حیثیت، لاہور، اسلام پبلی کیشنز، ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۔ (۴) منکرین حدیث کے انکار حدیث پر مبنی لٹریچر کی تفصیل اس مقالہ میں پیش ناممکن نہیں، چند کتب جن کے مندرجات میں انکار حدیث کا مواد پایا جاتا ہے، کے نام بطور حوالہ درج کیے جارہے ہیں۔ مثلاً عبداللہ چکڑالوی کا ترجمہ قرآن بآیات القرآن، غلام احمد پرویز کا رسالہ طلوع اسلام، عبداللہ چکڑالوی کا رسالہ اشاعۃ القرآن اور صلوٰۃ القرآن، سرسید احمد خان کی تصنیف خطبات احمدیہ اور مقالات جیراج پوری وغیرہ۔ (۵) ''فتنۂ انکار حدیث کے رد میں برصغیر کے دینی رسائل و جرائد کی خدمات کا جائزہ'' کے عنوان سے راقم الحروف نے علاحدہ مضمون مرتب کیا ہے، دیکھیے: مجلّہ ''تحقیق''، کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۹۸ء، ج ۱۹، ص ۳۱۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کے استاد
''مولوی مفتی محمد ارشاد حسینؒ مجددی رام پوری''

تبسم صابر

تاج الفقہاء حضرت علامہ مولانا ارشاد حسین مجددی تیرہویں صدی ہجری میں رام پور کے ان ممتاز و نامور مفکرین و محدثین میں شامل ہیں جنہوں نے اپنے دور میں مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لیا اور پھر ان کی اصلاح کے لیے بڑے سلیقے سے قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے افکار پیش کیے۔ جن سے ہزاروں، لاکھوں طالبان علم و شوق نے استفادہ کیا اور علم و فضل کے بلند مدارج تک پہنچے۔ ان اصحاب فضل و کمال میں ایک علامہ شبلی نعمانیؒ بھی تھے جن کو مولانا مفتی محمد ارشاد حسین صاحب سے فخر تلمذ حاصل ہے وہ تمام عمر اکثر اہم معاملات میں ان سے صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ جس کی تصدیق علامہ شبلی کے اس خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے مولانا ارشاد حسین کو لکھا تھا۔ اس خط کی تفصیل آیندہ اپنے مقام پر آئے گی۔ فی الحال یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مولانا ارشاد حسین کے مختصر حالات و کوائف بیان کر دیے جائیں تاکہ مولانا کی زندگی کے کچھ واضح نقوش قاری کے سامنے آسکیں۔

مولانا ارشاد حسین کے آباء و اجداد اصلاً سرہند کے رہنے والے تھے۔ سرہند میں سکھوں کے تسلط کے بعد ہجرت کر کے بریلی تشریف لائے، بریلی میں کچھ دن قیام فرما کر حضرت سید حافظ شاہ جمال اللہ نقشبندی مجددی متوفی ۱۲۰۹ھ کی تحریک پر رام پور آئے۔ اور محلّہ پیلا تالاب پر رہائش اختیار کی۔ مولانا ارشاد حسین کی پیدائش رام پور میں اسی محلّہ میں ۱۴؍ صفر المظفر ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء کو ہوئی۔ مصنف ''نزہۃ الخواطر'' نے ان کا سلسلۂ نسب تحریر کیا ہے:

ریسرچ اسکالر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

" الشیخ العالم الفقیه ارشاد حسین بن احمد حسین بن محی الدین ابن فیض احمد بن کمال الدین بن درویش احمد بن زین بن یحییٰ بن احمد العمری السرهندی ثم الرامفوری احد العلماء المشهورین فی الهند ، کان من نسل الشیخ احمد بن عبد الاحد السرهندی امام الطریقة المجددیة " ۔ (۱)

مولانا مفتی محمد ارشاد حسین نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد حکیم احمد حسین مجددی، اپنے بڑے بھائی مولوی امداد حسین مجددی متوفی ۱۲۵۹ھ اور شیخ احمد علی متوفی ۱۲۶۶ھ، سے حاصل کی اور زبان فارسی میں کامل دسترس حاصل ہونے کے بعد دوسرے علوم مولوی حافظ غلام نبی، مولوی جلال الدین، مولوی نصیر الدین خاں اور چند دوسرے علماء لکھنؤ سے حاصل کیے۔ علوم معقول کی تکمیل کی غرض سے رام پور میں ملا محمد نواب افغانی نقشبندی کے درس میں شریک ہوئے۔ جب ملا محمد نواب افغانی رام پور سے ترک تعلق کر کے دہلی جانے لگے تو مولانا ارشاد حسین بھی ان کے ساتھ ہولیے اور ان سے باقی علوم کی تکمیل کی۔ ملا محمد نواب افغانی کی رہنمائی سے عارف کامل حضرت علامہ مولانا مفتی شاہ احمد سعید مجددی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور کچھ عرصہ شیخ کی خدمت میں رہ کر کمالات باطنی سے فیض حاصل کیا۔ علامہ مولانا مفتی شاہ احمد سعید نے آپ کی لیاقت کی قدر کرتے ہوئے خلافت کے عہدہ جلیلہ سے سرفراز فرمایا۔ جب شیخ غدر ۱۸۵۷ء کے پرآشوب حالات سے گھبرا کر مکہ معظّمہ ہجرت کرنے کا قصد کرنے لگے تو مولانا ارشاد حسین بھی ان کے ہمراہ ہولیے۔ شیخ کی ہمراہی میں ابھی پانی پت تک ہی پہنچے تھے کہ شیخ صاحب نے آپ کو وطن واپسی کا حکم دیا۔ شیخ کے حکم سے انکار کی گنجائش نہیں تھی اس لیے ناچار رام پور واپس تشریف لائے۔ لیکن پھر کچھ ہی دنوں بعد حج و زیارت کا ارادہ کیا اور پیدل آٹھ ماہ کی طویل مدت میں سفر کی بیشمار صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے مکہ معظّمہ پہنچے۔ زیارت خانہ کعبہ اور روضہ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فارغ ہو کر حضرت مولانا مفتی محمد شاہ احمد سعید کی خدمت بابرکت میں پہنچے اور تقریباً ایک سال شیخ کی خدمت میں رہ کر مناسک سلوک طے کیے اور منصب قطبیت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد شیخ کی اجازت سے رام پور واپسی فرمائی اور عارف باللہ مولانا عبدالکریم عرف ملا فقیر

اخوند قادری چشتی کی خانقاہ کے حجرے میں اقامت گزیں ہوئے۔اسی حجرے میں آپ نے نو ماہ کے قلیل عرصہ میں کلام پاک حفظ کیا۔(۲)

مولانا ارشاد حسین کے عادات واخلاق کا شہر پر خاص اثر تھا۔لوگوں کے دلوں میں مولانا کے لیے بڑی عقیدت تھی۔مولانا بڑے سادہ دل انسان تھے۔خوش لباسی،خوش اوقاتی اور خوش اخلاقی آپ کا وطیرہ تھی۔جس سے بھی ملتے بڑی محبت وشفقت سے ملتے۔محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے۔حد درجہ قناعت پسند واقع ہوئے تھے۔کبھی ان کے اوقات نماز میں فرق نہیں ہوا۔ہمہ وقت اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔خصوصاً ''حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل''اور''مامن دابة فی الارض الا علی اللّٰہ رزقھا'' کثرت سے پڑھتے تھے۔عموماً لوگ اپنی امانتیں ان کے پاس رکھواتے تھے۔جری و بے باک اس درجہ تھے کہ حق کے خلاف کوئی بات ہرگز برداشت نہیں کرتے بلکہ اکثر مواقع پر نواب رام پور کلب علی خاں کو بھی ٹوک دیا کرتے تھے۔نواب کلب علی خاں کو موصوف سے بڑی انسیت تھی۔بہت ساری رعایات ان کو دے رکھی تھیں۔اکثر معاملات ریاست میں مولانا کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔حافظ احمد علی شوق لکھتے ہیں:

> ''محمد ارشاد حسین مجددی کے انکار کے باوجود نواب کلب علی خاں نے انتہائی اصرار سے خدام خانقاہ کے مصارف کے لیے تقریباً ۴۰۰ روپے ماہانہ ریاست سے مقرر کر دیے تھے''۔(۳)

درس وتدریس: ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں محلّہ کھاری کنواں رام پور میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کو بیت الارشاد اور دارالارشاد بھی کہا جاتا تھا۔اس مدرسہ میں مولانا بذات خود طلبہ کو دن میں دوبار درس دیا کرتے تھے ایک بار صبح میں نماز فجر کے بعد،اوراد و وظائف،دعائے حزب البحر، نماز اشراق،نماز استخارہ اور ختم حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ سے فراغت کے بعد سے نماز ظہر تک اور دوبارہ نماز عصر کے بعد سے لے کر مغرب تک،البتہ ہفتہ میں دو روز منگل اور جمعرات کو طلبہ کو درس نہیں دیا کرتے تھے۔یہ دونوں دن آپ نے فتاویٰ لکھنے کے لیے مقرر کیے تھے۔مولانا کے اس مدرسہ میں کتب تصوف مثلاً مثنوی مولانا روم،مکتوبات امام ربانی،عوارف المعارف،احیاء العلوم اور قصیدہ فارضیہ(؟) وغیرہ پڑھائی جاتی تھیں۔لاکھوں تشنگان علوم دینیہ

دور دراز کا سفر آپ سے اکتساب فیض کی خاطر طے کر کے آتے اور مولانا کے حلقہ درس میں شامل ہو کر بیش بہا علمی جواہر اپنے اپنے دامنوں میں بھر کر لے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ سے کسب فیض کرنے والے تلامذہ کرام کی ایک طویل فہرست ہے۔ چند مشہور تلامذہ کے نام ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔(۴)

۱- مولانا محمد طیب عرب مکی پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور۔

۲- مولانا عبدالقادر خاں نقشبندی مجددی۔

۳- مولانا عبدالقادر خاں کابلی مفتی عدالت ریاست رام پور۔

۴- مولانا سید شجاعت علی رام پوری مدرس مدرسہ ارشادالعلوم۔

۵- مولانا سراج الدین احمد خاں رام پوری نائب مجسٹریٹ جے پور۔

۶- مولانا عبداللہ نقشبندی مہاجر و محدث حرم شریف۔

۷- مولانا شبلی نعمانی مولف سیرت النبیؐ۔

۸- صاحبزادہ مولانا علی عباس خاں رام پوری مفسر قرآن (تفسیر سورہ یوسف بے نقطہ عربی زبان میں لکھی)۔

تصانیف: مولانا ارشاد حسین کا زیادہ تر وقت فتاویٰ کا جواب تحریر کرنے اور طلباء کو درس دینے میں گزرتا تھا اس لیے انہیں باقاعدہ کسی تصنیف کا موقع کم ہی مل سکا۔ ان کی یادگار زیادہ تر وہ فتاویٰ ہیں جنہیں فتاویٰ ارشادیہ کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کر کے مولانا مفتی عبدالغفار خاں رام پوری شاگرد و خلیفہ مولانا محمد ارشاد حسین نے طبع کرایا۔ یہ کل ڈھائی سو فتاویٰ کا مجموعہ ہے، پہلی جلد ۱۴۰ صفحات پر اور دوسری ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

فتاوی ارشادیہ کے علاوہ ''انتصار الحق'' صفحات ۴۱۶ مطبوعہ اور ''ارشاد الصرف'' صفحات ۲۴۰ مطبوعہ بھی مولانا کی یادگار ہیں۔ ''انتصار الحق'' میں مولانا نے دلائل عقلیہ ونقلیہ سے تقلید کے وجوب کو ثابت کیا ہے اور ''ارشاد الصرف'' درحقیقت ان مسائل صرف کی تقاریر کا مجموعہ ہے جو مولانا مفتی محمد ارشاد حسین، مولانا حافظ عنایت اللہ خاں کو دوران درس لکھوایا کرتے تھے۔

مولانا نے کتاب الجبل عالم گیری کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا اور ابوداؤد شریف کا نسخہ جسے

نواب رام پور کلب علی خاں نے خوش خط اور مطلا و مذہّب لکھوایا تھا نواب رام پور کی خواہش پر سید حسن شاہ محدث کے ساتھ مل کر اس کی تصحیح کی تھی (۵)۔مزید برآں علمائے زمانہ کی بلند پایہ تصانیف پر ان کے قلم کی لکھی بیش بہا تقاریظ بھی درج ہیں۔

۱۵؍ جمادی الاخری ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء کو دوشنبہ کے دن مولانا مفتی محمد ارشاد حسین کی وفات ہوئی (۶)۔اس وقت ان کی عمر ۶۱ سال تھی۔مولانا نے اپنی عمر کے تقریباً تیس سال وعظ وارشاد اور مسترشدین کی تلامذہ و تعلیم و تربیت میں گزارے۔جس وقت ان کے انتقال کی خبر اہل رام پور کو پہنچی سارا شہر ماتم کدہ بن گیا۔جس نے بھی سنا نماز جنازہ میں شرکت کے لیے دوڑا چلا آیا۔عیدگاہ کے میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔مولانا کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جن میں سے دو بیٹے صغرسنی میں ہی انتقال کر گئے تھے۔

گو مولانا مفتی محمد ارشاد حسین کی ذات ستودہ صفات اس بات کی ہرگز محتاج نہیں ہے کہ ان کے مقام و مرتبہ کو ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کیے جائیں تاہم یہاں ہم بعض ارباب فکر و نظر کی آراء کو صرف اس لیے نقل کر رہے ہیں تاکہ یہ جانا جاسکے کہ مولانا کی ذات اپنے معاصرین و متاخرین اہل کمال کے لیے کس درجہ متاثر کن ثابت ہوئی۔سب سے پہلے ہم مولانا کے شاگرد رشید علامہ شبلی نعمانی کے اس تعلق خاطر کا ذکر کریں گے جو علامہ کو مولانا سے تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مدیر ''معارف'' اعظم گڈھ مولف حیات شبلی لکھتے ہیں:

> ''شبلی نعمانی کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا اور اکثر برسبیل تذکرہ ان کے کمال فہم و ادراک اور تفقہ کے واقعات بیان فرماتے۔مولانا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے، مولوی نذیر حسین صاحب کی ''معیار الحق'' ان ہی نے لکھی ہے اور علامہ شبلی کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا غالباً یہی ایک وجہ انتخاب ہوئی۔بہرحال مولانا نے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کے حلقہ درس میں بیٹھ کر فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی''۔(۷)

مولانا سید سلیمان ندوی علامہ شبلی نعمانی کے رام پور اور لاہور کے تعلیمی سفر ۱۲۹۱ھ و

۱۲۹۲ھ کے تحت یہ بھی لکھتے ہیں:

''رام پور میں خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے ارباب کمال یکجا کر دیے تھے۔ راقم نے خود استاد مرحوم کی زبانی سنا ہے کہ اول اول ان کو مولانا عبدالحئی فرنگی محلی مرحوم کی شہرت کمال لکھنؤ لے گئی۔ مگر علامہ مرحوم کچھ تو فطری جودت طبع اور کچھ فیض فاروق کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے ہی جوہر کی تلاش کرتی، اس لیے زانوے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے اور رام پور کا رخ کیا۔ یہاں اس وقت دو باکمال اپنے اپنے وقت میں یکتائے روزگار تھے۔ معقولات میں سلسلہ خیر آبادی کے خاتم مولانا عبدالحق خیر آبادی اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی، ابتداءً مولانا کی خواہش تھی کہ دونوں سے استفادہ کریں مگر ان بزرگوں میں معاصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک شاگرد دوسرے کے حلقۂ درس میں باریاب نہ ہوسکتا تھا، مجبوراً مولانا کو انتخاب کرنا پڑا''۔

یہ تو تھے وہ تاثرات جو ایک شاگرد نے اپنے استاد سے ان کے استاد کے متعلق سنے یا محسوس کیے۔ علاوہ ازیں دوسرے اصحاب فن مثلاً حافظ احمد علی شوق مولف ''تذکرہ کاملان رام پور'' مولانا محمد ارشاد حسین کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''مولانا ارشاد حسین مجددی۔ حافظ کلام ربانی، محدث، مفسر، فقیہ، درویش، مدبر غرض کہ ظاہری و باطنی کوئی ایسا کمال نہیں ہے جو آپ کی ذات میں موجود نہ ہو''۔(۸)

حافظ محمد حسین مرادآبادی ''انوارالعارفین'' میں لکھتے ہیں:

''مولوی ارشاد حسین۔ حافظ آیات قرآنی، واقف اسرار ربانی، مفسر کلام رب العالمین، محدث حدیث سیدالمرسلین، مدرس فقہ و اصول، فہمندہ دقائق معقول عالم اند، متقی و متورع، اکثر اوقات خود را بہ درس و تدریس می گذارند و عمل برعزیمت''۔(۹)

''تذکرہ علمائے اعظم گڑھ''میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی قاسمی رقم طراز ہیں:

''مولانا ارشاد حسین رام پوری اپنے عہد کے مشہور علمائے احناف میں تھے۔حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی نسل سے تھے،آپ کی ولادت رام پور میں ہوئی اور وہیں ملا نواب بن سعد اللہ افغانی سے معقول و منقول کی تکمیل کی اور جملہ علوم میں اپنے معاصرین میں ممتاز مقام پر فائز ہوگئے''۔(۱۰)

مشہور محقق مولوی امتیاز علی خاں عرشی مرحوم سابق ڈائریکٹر رام پور رضا لائبریری رام پور نے تحریر کیا ہے:

''مولانا ارشاد حسین مجددی رام پوری رام پور کے مشہور عالم،حافظ کلام ربانی، محدث،مفسر،فقیہ،مدبر اور درویش تھے۔بڑے خوش لباس،خوش اخلاق اور خوش اوقات بھی تھے۔نواب کلب علی خاں بہادر بہت ادب و تعظیم کرتے تھے،اوراد و وظائف اور حلقہ و مراقبے سے کوئی وقت خالی نہ ہوتا۔ان اشغال کے ساتھ درس و تدریس اور وعظ و پند کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔دربار اور اہل شہر دونوں پر بڑا اثر تھا''۔(۱۱)

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے استاد محترم جناب مفتی محمد ارشاد حسین مجددی کو جو خط لکھا تھا اور بعض مسائل کے تشفی بخش جوابات کی درخواست کی تھی۔ہم یہاں اس خط کی نقل پیش کررہے ہیں۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''مخدوم و مطاع مادامت افضالہم۔پس از آداب مراسم تحیت و تسلیم آنکہ،ملازمان عالی کو معلوم ہوگا کہ بہت جد و جہد سے امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں جس کے لیے میں نے بہت سے مواد تاریخی فراہم کیے،اس وقت جو میرے زیر تحریر ہے وہ ان کے فتاویٰ ہیں۔عقود الجمان میں ان کے چند فتاویٰ مذکور ہیں،لیکن دو جگہ مجھ کو شک پیدا ہوا، اس لیے ان کو عرض کرتا ہوں کہ تشفی فرمائی جاوے۔اصلی عبارت لکھ کر شبہ لکھتا ہوں:

"قال یا ابا حنیفة یا ابا الخطاب ما تقول فی رجل غاب عن اهله اعواما و نعی الیها فظنت امرته انه میت فتزوجت ثم قدم زوجها الاول وقد ولدت ولداً فنفی الاول وادعاه الثانی اکل واحد منهما قذ فهما ام الذی

انکر الوالد“۔

مجھے اس میں شبہ یہ ہے کہ دونوں زوجوں میں سے کسی نے اس کو زانیہ نہیں کہا پھر قذف کیا معنی، باقی یہ امر کہ ولدیت کے ادعا اور انکار سے ضمناً قذف لازم آتا ہے، اس امر پر دو سوال ہیں: ۱- کیا کسی دلالت التزامی سے قذف کا جرم قائم ہوسکتا ہے؟ ۲- وہ عورت درحقیقت زانیہ ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی تو کیا واقعیت کا اظہار قذف میں داخل ہے؟ ایسا تفصیلی جواب عنایت ہو جو اصل مسئلہ کو حل کردے اور امام صاحبؒ کے اس سوال کی حقیقت کھول دے۔

دوسرا فتوی یہ لکھا کہ چند آدمی ایک جگہ بیٹھتے تھے، ایک شخص پر سانپ آکر گرا، اس نے دوسرے پر پھینک دیا۔ اسی طرح تین، چار آدمی تک نوبت پہنچی، آخر میں اس نے ایک شخص کو کاٹ لیا اور وہ مر گیا، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر گرنے کے ساتھ سانپ نے کاٹا تو اخیر پھینکنے والے پر دیت لازم آئے گی اور اگر وقفہ ہوا تو کسی پر نہیں، اس پر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص نے پھینکا یہ اس کا اضطراری فعل تھا، اس اضطراری فعل پر وہ کیوں ماخوذ ہوا، فقہ میں اس کے متعلق کیا امر قرار دیا ہے، جواب جلد مرحمت ہو، ورنہ میرا حرج ہوگا''۔(۱۲)

حواشی

(۱) نزہۃ الخواطر، ج ۸، ص ۴۹۔ (۲) تذکرہ کاملان رام پور، ص ۳۱، ۳۲، نیز مولانا ارشاد حسین مجددی از فقیر محمد نوری، ص ۱۱ تا ۱۴۔ (۳) تذکرہ کاملان رام پور، ص ۳۱۔ (۴) مولانا ارشاد حسین مجددی حیات وخدمات از فقیر نوری سید شاہد علی رضوی رام پوری، ص ۷ا تا ۱۳۔ (۵) تذکرہ کاملان رام پور، ص ۳۱۔ (۶) نزہۃ الخواطر، ج ۸، ص ۵۰۔ (۷) مولوی سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۸۷، ۹۷۔ (۸) تذکرہ کاملان رام پور، ص ۳۰۔ (۹) انوار العارفین از حافظ محمد حسین مراد آبادی، ص ۵۰۹۔ (۱۰) تذکرہ علمائے اعظم گڈھ از مولوی حبیب الرحمٰن قاسمی، ص ۱۰۳۔ (۱۱) فہرست مخطوطات اردو از مولوی امتیاز علی عرشی، ج ۱، ص ۱۲۸۔ (۱۲) فتاویٰ ارشادیہ، ج ۱، ص ۹۳۔

اخبار علمیہ

"سیرت پر سب سے بڑی کتاب"

عربی روزنامہ "شمس" کی ایک اطلاع کے مطابق ادارہ برائے قرآن سے وابستہ عبداللہ المصلح نے سیرت پر اب تک کی سب سے وزنی اور بڑی کتاب کا منصوبہ بنایا ہے۔ ۴۲۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ہر صفحہ چار سے پانچ میٹر لمبا اور اس کا کل وزن ۱۶ کوئنٹل ہوگا، چار عالمی زبانوں میں ترجمے کے ساتھ یہ گنیز بک کی فہرست کارہائے نمایاں میں شامل ہوجائے گا، تاہم اس کا اصل مقصد آنحضور ﷺ کی سیرت، عمل اور پیام کی اشاعت وفروغ ہے کہ آپ کی تعلیمات وہدایات کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آجائے، یورپ اور اس کے زیر اثر علاقوں میں نبی رحمت کی پاکیزہ ومقدس حیات کو شیطانی طاقتیں جس طرح داغدار بنانے کے ناپاک عمل میں مصروف ہیں اس کے پیش نظر سیرت کی یہ خدمت لائق تحسین ہے۔

"جاپانیوں کا استقلال قابل تقلید مثال"

گذشتہ دنوں جاپان میں سمندری طوفان کی قیامت سے پوری دنیا واقف ہے، جانی و مالی نقصانات کے علاوہ اس سے فوکوشیما کے جوہری پلانٹ کے ریکٹر کو جو شدید نقصان پہنچا اس نے اس علاقہ میں ریڈی ایشن کا زبردست خطرہ پیدا کردیا، درجہ حرارت کو قابو میں لانے کے لیے پچاس سے زیادہ افراد پر مشتمل جاپانی ٹیم نے جس فرض شناسی، کدوکاوش، پامردی اور جان کی بازی لگانے کا مظاہرہ کیا وہ انسانی اولوالعزمی کی تاریخ میں یادگار رہے گا، سنامی کی تباہی کا تخمینہ تین سوبلین ڈالر لگایا گیا، کئی بستیاں صفحۂ وجود سے نیست و نابود ہوگئیں، چودہ ہزار انسان لقمۂ اجل ہوگئے اور قریب اتنے ہی لوگ مفقود الخبر ہیں، اس قدر بربادی کی شکار جاپانی قوم نے مشکل ترین حالات میں جس صبر وضبط اور استقامت کا ثبوت دیا وہ یقیناً پوری دنیا کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے، پانی اور غذا کی تقسیم کے وقت خانمان برباد شہریوں کی افراتفری عین ممکن ہے لیکن مصیبت زدہ جاپانیوں نے ایسے وقت میں سکون کے ساتھ لمبی قطاروں میں نظم وضبط کو برقرار رکھا، ضروری اشیاء کی قلت کے باوجود ان کے حصول کے لیے دست و پا کو بے قید نہیں کیا، تشدد اور دھینگامشتی تو دور کی بات ہے، تلخ اور درشت رویہ کا بھی اظہار نہیں ہوا، ناشائستگی کا ایک بھی منظر سامنے نہ آیا، جوان اور توانا خود مستحق اعانت ہونے کے باوجود کمزوروں کی مدد کرتے نظر آئے، اشیائے ضروریہ میں فوری ضرورت سے

زیادہ سامان نہیں لیا کہ دوسروں کو تکلیف ہوسکتی ہے، مکانوں اور عمارتوں کی تعمیر میں کہیں بے ضابطگی کی خبر نہیں آئی، ذرائع ابلاغ نے بھی خوف و ہراس یا سنسنی خیزی کے بہ جائے معتدل خبریں اور تصویریں عوام تک پہنچا کر ان میں صبر و سکون قائم کرنے کی قابل تعریف کوششیں کیں۔

''تاجیکستان کی تعلیمی حالت''

انسائیکلوپیڈیا، ماسکو کے مطابق سوویت یونین کے حصار و تسلط سے آزاد ہونے والی ریاستوں میں تاجیکستان دنیا کے خوبصورت ترین خطوں میں شامل ہے، اس کا رقبہ ایک لاکھ ۴۳ ہزار ایک سو مربع میٹر ہے، ۹۳ فیصد علاقہ کوہستانی، قدرتی وسائل اور بیش قیمت معدنیات سے مالا مال ہے، اس مسلمان ملک کا دارالحکومت ''دوشنبے'' ہے، ۲۰۰۳ء میں ۶ء۲ ملین آبادی تھی جو ۲۰۱۰ء میں ۹ء۷ ملین ہوگئی، ۸۸ فیصد مسلمان ہیں، دوسری قوموں میں جرمن، یوکرینی، افغانی اور روسی وغیرہ ہیں، ان کی آبادی میں اب کمی آئی ہے، اوسط عمر ۴۶ برس ہے، فی کس آمدنی ۷۰۰ ڈالر ہے، مسلمان راسخ العقیدہ سمجھے جاتے ہیں، روسی تسلط کے زمانے میں بھی یہاں اسلامی شعائر اور اقدار کی پاس داری تھی، جب خفیہ طریقے سے اسلامی تعلیمات کا نظام مضبوطی اور حوصلہ مندی سے جاری رہا، قرآن، حدیث اور فقہ کے ساتھ تاریخ اسلام کی تعلیم دی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سخت ممانعت کے باوجود عربی زبان کے علماء تیار ہوتے رہے، آزادی کے بعد توقع تھی کہ حکومت بدلنے سے حالات بہتر ہوں گے لیکن ۱۹۹۹ء کے بعد صدر ریاست اور اسلام پسندوں کے درمیان کشمکش شروع ہوئی اور یہ اب سخت تکلیف دہ مرحلے میں آگئی ہے، حالت یہ ہے کہ اب تعلیمی اداروں اور سرکاری دفتروں میں داڑھی اور اسکارف کی ممانعت سے بڑھ کر اسلامی تعلیم کے حصول اور نماز کے لیے مسجدوں میں جانے پر پابندی کا بل گذشتہ دنوں پارلیمنٹ میں منظور کیا گیا ہے، نئے قانون کے مطابق ۱۹۹۱ء کے بعد تعمیر شدہ مساجد میں داخلہ پر پابندی ہے، تعلیمی لحاظ سے تاجیکستان میں ۱۹۹۱ء میں تعلیم کا تناسب صد فیصد تھا، اس میں بھی انحطاط آیا اور اب یہ ۹۵ فیصد ہوگیا ہے، تعلیم پر سرکاری اخراجات روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں اور دیہاتوں میں بیس فیصد بچیاں ابتدائی تعلیم سے بھی محروم ہیں۔ قومی پیداوار کا صرف ۵ء۳ فیصد تعلیم کے لیے مختص ہے۔

''سوڈان میں اسلامی آئین کا نفاذ''

جنوبی سوڈان کی آزادی کے تین ماہ بعد صدر عمر حسن البشیر نے خرطوم میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ سوڈان میں مکمل طور پر اسلامی آئین و شریعت کا نفاذ کیا جائے گا اور ملک کا سرکاری مذہب

اسلام ہوگا، ۲۰۰۵ء میں امن معاہدے کے بعد مسلم اکثریتی شمالی سوڈان اور عیسائی اکثریتی جنوبی سوڈان کے درمیان کئی دہائیوں سے جاری خانہ جنگی ختم ہوگئی تھی اور اس وقت جو عبوری قانون بنایا گیا تھا، اس کے مطابق اسلامی قوانین کا نفاذ شمالی علاقوں تک ہی محدود رہے گا، سوڈانی عوام کی ثقافتی اور معاشرتی تنوع اور رنگارنگی قائم رہے گی، اب اس تازہ اعلان واقدام سے ایک غیر یقینی صورت حال کا قیاس کیا جارہا ہے۔

''موبائل کا زیادہ استعمال نقصان دہ''

موبائل کے فائدوں کے ساتھ اس کے نقصانات بھی مسلسل گنائے جاتے ہیں، حقیقت یہی ہے کہ اثمہ اکبر من نفعہ کا مصداق یہ ایجاد بھی ہے، اب لندن کے ماہرین کی تحقیق سامنے آئی ہے کہ موبائل کے استعمال کی زیادتی سے ''ٹیکسٹ نِک'' نامی بیماری لاحق ہوسکتی ہے یعنی زیادہ دیر تک ایک جانب گردن جھکانے یا موڑنے سے یہ بیماری ہوتی ہے، بروقت علاج نہ کرانے سے وجع مفاصل کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے کیوں کہ جھکاؤ یا تناؤ کے سبب بافتین بالاخر اس خمیدگی سے مطابقت پیدا کرلیتی ہیں جس کے سبب گردن کو سیدھا کرنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔

''قرآن نمائش''

ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع گرداس پور کا قصبہ ''قادیان'' ایک کاذب مدعی نبوت کے سبب مفت میں رسوا ہوا، اصلاً تو اس مدعی کے ماننے والے غلامیہ ہیں لیکن احمدی اور قادیانی کی نسبت ان کے مکر کا پردہ ہے، مختلف ملکوں میں ان کی دس ہزار عبادت گاہیں اور سینکڑوں مدارس ہیں، علمائے اسلام کا متفقہ فیصلہ اور فتویٰ ہے کہ یہ فرقہ گمراہ اور دائرہ اسلام سے خارج ہے لیکن دوسرے کئی گمراہ فرقوں کی طرح ہندوستان میں ان کی سرگرمیاں جاری ہیں اور بہ ظاہر مسلمان نام اور شکل سے کئی سادہ لوح مسلمان ان کے دام تزویر و فریب میں آجاتے ہیں، ان کا ایک احمدیہ انٹرنیشنل چینل بھی ہے جہاں سے ان کی سرگرمیوں کی نشرواشاعت ہوتی ہے، اپنی مرضی کے مطابق قرآن پاک کا ترجمہ ۷۰ زبانوں میں شائع کیا ہے جو یہود ونصاریٰ کی طرح تحریف معنی کی نئی تصویر ہے، پچھلے دنوں انہوں نے ''کانسٹی ٹیوشن کلب'' میں قرآن نمائش کرنا چاہی تو دہلی اور ملک کے مسلمانوں کے احتجاج نے ان کے اس فتنہ کو دبانے میں کامیابی حاصل کی لیکن اصل کامیابی ان کے کذب وافترا اور سازشوں سے واقف ہونے اور واقف کرانے میں ہے۔

ک،ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

غالب اور بدایوں

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب

مرزا اسداللہ خاں غالب ادبی تحقیق کا ایک مستقل موضوع بن چکے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محققین اردو کے لیے غالبیات سے شغف رکھنا ان کے ادبی وقار کا مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بیشتر اعلیٰ درجے کی تحقیقات مرزا غالب کے حوالے ہی سے پیش کی جاتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر شمس بدایونی بنیادی طور پر محقق ہیں۔ غالب اور غالبیات کے حوالے سے مستقل کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں۔ان کے اس سلسلے میں اب تک تقریباً ۳۵ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ دو کتابیں ''غالب اور بدایوں'' (۲۰۱۰ء) اور ''مرزا غالب'' (۲۰۱۱ء) گزشتہ دنوں شائع ہوئی ہیں۔ زیر نظر تحریر میں ''غالب اور بدایوں'' کے حوالے سے کچھ عرض کیا جارہا ہے۔

مصنف نے اس کتاب کے پیش گفتار میں وضاحت کی ''کہیں بدایوں کو غالب کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی ہے اور کہیں بدایوں کے حوالے سے غالب تک رسائی کے راستے تلاش کیے ہیں'' اور ''یہ کتاب جہاں غالب اور بدایوں کی تاریخی وادبی اہمیت کی تفہیم میں مدد دے گی، وہیں غالب اور متعلقات غالب پر ماہرین غالبیات کے پیش کردہ کار تحقیق کو بھی سہارا دے گی (ص ۱۲)۔ مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب مواد، مواد کی ترتیب اور مواد کی تنقیدی و تحقیقی پیشکش کا ایک نمونہ بن گئی، بدایوں اور غالب لازم وملزوم بن گئے۔ غالب کو بدایوں نے اور بدایوں نے غالب کو عظمت بخشی۔ مختصر یہ کہ کتاب کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ اس کی اشاعت سے مطالعہ غالب میں نہ صرف نئی جہت اور نئی سمت کا تعین ہوتا ہے بلکہ اضافہ بھی۔ لہٰذا مصنف کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ''راقم الحروف نے اس کتاب میں بدایوں سے

بریلی، یوپی۔

غالب کی نسبت کی ہر صورت اور غالبیات کے واسطے سے جملہ شکلوں کو تاریخی تسلسل اور تالیفی نظم و ترتیب کے ساتھ محفوظ کرنے کی سعی کی ہے'' (ص۱۱)۔ الحاصل غالب اور بدایوں کے مابین یہ التزامی کیفیت برگ حنا کی طرح ہے جو نقد و تحقیق کے پتھر پر پسنے کے بعد سرخ رو ہوئی ہے۔

اس کتاب میں سات ابواب ہیں۔ کتابیات کے علاوہ اشخاص کتب اور رسائل پر مشتمل اشاریہ بھی ہے۔ باب اول میں تین ضمنی عنوانات ہیں:

۱- بدایوں کی تاریخی و ادبی اہمیت، ۲- عہد غالب کا بدایوں۔ ایک منظر نامہ، ۳- بدایوں میں غالب کے مخالفین و مداحین۔ مصنف نے بدایوں کی تاریخ کے سلسلے میں مورخین بدایوں سے استفادہ کیا اور بالعموم ان تمام روایتوں کو دہرا دیا جو ان کی کتب تاریخ میں ملتی ہیں۔ یہ حصہ سرسری تعارف پر ہی مشتمل ہے۔

''عہد غالب کا بدایوں۔ ایک منظر نامہ'' کو برائے تفہیم دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اولاً بدایوں میں تحریک احیائے دین اور ثانیاً بدایوں کی ادبی سرگرمیاں اور غالب۔ مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م۱۷۶۲ء) کی تحریک احیائے دین اور اس کے زیر اثر شاہ اسماعیل دہلوی (م۱۸۳۱ء) کی توحید خالص، اصلاح رسوم و بدعات پر ان کی تالیفات اور آخر میں دیوبندی اور بریلوی مسالک کے آغاز و اختلاف پر نہایت دیدہ ریزی، غیر جانب داری اور عالمانہ انداز میں گفتگو کی ہے جس کے پس منظر میں مصنف نے علمائے بدایوں کی موید و مخالف تالیفات اور خود غالب کی مثنوی ''بیان نموداری شان نبوت و ولایت'' کے حوالے سے غالب کے امکان نظیر و امتناع نظیر کے مسئلے پر نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ مومن خان مومنؔ (م۱۸۵۱ء) جس طرح سید احمد بریلوی (م۱۸۳۱ء) کے افکار و نظریات سے متاثر تھے وہیں غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی (م۱۸۶۱ء) کے خیالات کی تائید کی تھی جو غالب کی افتاد طبع کے پیش نظر جز وقتی بھی ہوسکتی ہے۔ مصنف نے لفظ ''وہابی'' کے آغاز و ارتقاء اور اس کے معنی و استعمال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ (ص۳۴-۳۵) جو راقم الحروف کے علم میں پہلی بار آئی۔ الحاصل اس مضمون کا یہ حصہ مطالعہ غالب اور عہد غالب کے حوالے سے ایک علمی کارنامے سے کم نہیں۔ اس کے بعد مصنف نے عہد غالب کے پس منظر میں بدایوں کی ادبی

سرگرمیوں کا سرسری جائزہ پیش کیا ہے جس سے بعض اہم تصنیفات، مصنّفین، مطابع، اخبارات وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ مصنف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس وقت دینی تحریک اور نزاع مسالک کا اتنا زور تھا کہ ادبی سرگرمیاں دب گئیں۔ کتنے ہی سخنور بہ سلسلہ ملازمت بیرون جات چلے گئے۔ ''اس کے باوجود پورا شہر ایک علمی و ادبی ماحول پیش کرتا تھا''۔ (ص ۳۸)

''بدایوں میں غالب کے مخالفین و مداحین'' میں مصنف نے ضلع بدایوں کے مردم خیز قصبہ سہسوان کے، بروایت غالب، کسی فرد کے قاطع برہان کا رد تحریر کرنے کی بابت گفتگو کی ہے جو راقم الحروف کی نظر میں محض ظنی و قیاسی ہے۔ ایک ایسا واقعہ جو غالب کا شنیدہ تھا اور جس کے صدور کا حتمی ثبوت نہیں ملتا، اس پر دماغ سوزی سے فائدہ؟ مصنف نے خود بھی اقرار کیا ہے کہ اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ رد غالب کی بنیاد سہسوان میں رکھی گئی تھی (ص ۴۷)۔ اس کے بعد مصنف نے غالب کے مخالفین میں علی بخش خاں شؔرر بدایونی (م ۱۸۸۵ء) اور معرفین میں انوار حسین تسؔلیم سہسوانی (م ۱۸۹۲ء)، دلدار علی مذاؔق بدایونی (م ۱۸۹۴ء) اور مفتیان بدایوں کا ذکر کیا ہے۔

باب دوم کا عنوان ہے ''بدایوں اور تلامذہ غالب'' جس کو تین ضمنی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱- غالب کے تلامذہ۔ ۲- غالب سے تلمذ کا غلط انتساب۔ ۳- غالب کے تلامذہ کے تلامذہ۔ مصنف نے مد (۱) کے ضمن میں آٹھ بدایونی تلامذہ غالب کا تعارف پیش کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

قاضی عنایت حسین رشکؔی (م ۱۲؍ نومبر ۱۹۱۸ء): مصنف نے ان کے حالات بیان کیے۔ ایک بیاض کو متعارف کرایا جس میں ان کا کلام ہے اور جو نواب رحمت اللہ خاں شروانی، مزمل منزل علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مصنف نے ان کے تخلص پر بحث کی اور مالک رام و حنیف نقوی کی آراء کے خلاف فراق کی جگہ رشکی کو صحیح تخلص ثابت کیا۔ مصنف نے ان کو حیات نو عطا کی ہے۔

نواب محمد زکریا خاں زکؔی دہلوی (م ۱۹۰۳ء): غالب کے نامور شاگرد ہیں۔ انہوں نے زندگی

کے آخری سات سال بدایوں میں گزارے اور وہیں فوت ہوئے ۔ مصنف نے بدایوں کے ساگرتال کے قبرستان میں ان کی قبر کی نشان دہی کی ہے ۔ قبر پر کتبہ نہیں ہے ۔ ان کے تلامذہ اور مطبوعہ کلام پر بھی معلومات فراہم کی ہیں ۔ ایسی صورت میں کہ ان کا خاندان سادات کشمیر سے تھا، جو دہلی کے متوطن تھے ۔ بدایوں میں پیدا نہیں ہوئے ، ان کو بدایونی تلامذہ میں شمار کرنا کہاں تک درست ہے؟

مولوی محمد عزیز الدین عزیز وصادق (م ۱۸۹۴ء): غالب کے بدایونی تلامذہ میں ان کی حیثیت اہم ترین ہے ۔ یہ ایک ایسے فرد ہیں جن کے ذکر سے غالب کے بدایوں سے اقرب تعلق کی شہادت ملتی ہے ۔ دراصل ان کے دادا حافظ عبدالموید خاں (م ۱۸۳۸ء) اور والد مولوی اساس الدین خاں (م ۱۸۸۲ء) دہلی میں رہتے تھے اور غالب سے تعلق تھا ۔ مصنف نے صادق کے جملہ دستیاب حالات کو نظر ثانی کے بعد یکجا کیا ہے ۔ ان کے حالات میں ان کے صاحبزادگان کے حالات کا اضافہ کیا ہے ۔ صادق کا کلام دستبرد ہو گیا ۔ مصنف نے دستیاب ۱۹ اردو اشعار میں ۱۲۸ اردو اشعار اور ۱۱۳ اشعار کی غزل کا اضافہ کیا ہے ۔ ان کی ایک مثنوی ''ثمرۂ الفت'' کو بھی متعارف کرایا ہے جو غالب کی نظر سے نہیں گزری ہوگی کیوں کہ ''ثمرہ الفت'' سے ۱۲۵۶ء کے اعداد برآمد ہوتے ہیں ۔ اس وقت صادق کی عمر ۱۲ سال کی تھی ۔ اس مثنوی کے اشعار (ص ۹۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک پیر فرتوت کے جوان العمر حسینہ پر عاشق ہونے کا مجازی افسانہ ہے لیکن بہ باطن عشق حقیقی کا اشارہ ۔ اس مثنوی میں غالب سے منسوب ایک شعر بھی نظم ہو گیا ہے ؎

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

یہ شعر غالب کے متداول دواوین میں نہیں ملتا ۔ مصنف نے اس شعر کی نشان دہی کرتے ہوئے ''تذکرۂ غوثیہ'' از شاہ گل حسین قادری (۱۸۸۴ء) سے اسی طرح کی ایک روایت اور نقل کی ہے اور غالب سے اس کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے ۔ مجموعی طور پر یہ مضمون جامع اور نئی معلومات کا ذریعہ ہے ۔

مولوی سخاوت حسین مدہوش (م ۱۹۰۱ء): ان کا سرسید سے تعلق تھا ۔ سرسید کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی رکھتے تھے ۔ ندوۃ العلماء کی تحریک میں بھی حصہ لیا ۔ ان کی نثری تالیفات میں

شراب الکوثر (۱۲۶۰ھ/۱۸۴۵ء)۔حالات سررشتۂ تعلیم (قیاساً ۱۸۸۲ء) اور تذکرۃ الواصلین از رضی الدین صدیقی بدایونی پر تقریظ (قیاساً ۱۹۰۰ء) علم میں آئی ہیں۔ان کا شمار بدایوں کے تعلق سے سرسید کے حامی اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے کرنا چاہیے۔مصنف نے تحریر کیا ''مدہوش کا غالب سے تعلق اور شاگردی سے متعلق بھی تفصیلات نہیں ملتیں۔ایسا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ عزیز الدین صادقؔ کے توسط سے وہ غالب کے شاگرد ہوئے ہوں''۔مصنف نے اس قیاس کی وجہ نہیں بتائی۔کسی حتمی ثبوت کی عدم موجودگی میں ان کو بے بنیاد قیاس پر غالب کا شاگرد بتانا جرات بے جا نہیں تو اور کیا ہے۔

حکیم سید احمد حسن فدا (م ۱۸۹۳ءؔ): مصنف نے دستیاب معلومات پر نظر ثانی کی۔ان کے خاندانی حالات ، تعلیم و تربیت اور غالب سے تلمذ پر گفتگو کی ۔ ان کے دیوان اور ان کی شاعری کو متعارف کرایا اور اردو اشعار نقل کیے۔ان کا تعلق ضلع بدایوں کے تاریخی قصبہ سہسوان سے تھا۔ان کی وفات بڑودہ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

میر عالم خاں مائلؔ: (۱۸۷۳ء یا ۱۸۷۷ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان) ان کے والد میر بخش کا تعلق سہسوان سے تھا اور وہ سہسوان کے نقوی سادات کی صالحی شاخ کے فرزند تھے۔مصنف نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ مائلؔ سہسوان میں پیدا ہوئے تھے،ان کی جائے وفات بھی مشکوک ہے،ان دونوں نکات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، مائلؔ کا غالب سے تلمذ شک و شبہ سے بالا ہے۔مصنف نے ان کے دستیاب اشعار کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔

میر ابراہیم علی خاں وفاؔ: (م ۱۸۸۸ء بروایت حنیف نقوی) ان کا خاندانی سلسلہ سہسوان کے نقوی سادات سے تھا لیکن بڑودہ میں پیدا ہوئے (۱۸۴۷ء) بڑودہ میں ہی ملازمت کی۔عمر کے دور آخر میں سہسوان کے اہل قلم سے خط و کتابت کی۔بڑودہ میں ہی فوت ہوئے اور وہیں تدفین ہوئی۔لہٰذا ان کا غالب کے تلامذۂ بدایوں میں شمار کرنا فہم سے بالا ہے۔

منشی آغا علی سہسوانی (م ۱۸۸۰ء): تخلص اور تالیفات کا علم نہیں۔غالب سے تلمذ کی تصدیق کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی۔سید اعجاز احمد معجزؔ سہسوانی (م ۱۹۵۲ء) نے اپنی قلمی کتاب تاریخ سہسوان میں بدون حوالہ ان کو غالب کا شاگرد تحریر کیا ہے۔ان کے بیان کے مطابق منشی آغا علی فارسی

کے استاذ تھے۔لہٰذا یہ گمان ہوا کہ ان کو فارسی میں غالب سے تلمذ ہوگا۔معجز سہسوانی ڈاکٹر حنیف نقوی (پیدائش ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے نانا تھے۔انہوں نے ہی منشی آغا علی کو تاریخ سہسوان کے حوالے سے غالب کا شاگرد تحریر کیا ہے۔مصنف نے بھی منشی آغا علی کو غالب کا شاگرد تسلیم کرلیا ہے۔تحقیق میں دوسروں کی بے حوالہ آراء کو آنکھیں موند کر قبول نہیں کیا جاسکتا ہے۔منشی آغا علی کا غالب سے تلمذ مزید تفتیش کا محتاج ہے۔

مصنف نے تحریر کیا کہ ''ان تلامذہ کے دستیاب جملہ ماخذ پیش نظر رکھتے ہوئے ازسرنو ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔مالک رام کی پیش کردہ معلومات کو بھی تحریر میں سمودیا ہے اوراس سلسلے کی تمام وکمال دستیاب معلومات کا احاطہ کرتے ہوئے ان تلامذہ کی غالب سے نسبت کو متحقق طور پرآشکارا کیا ہے'' (ص ۶۵)۔راقم الحروف کی نظر میں یہ مضمون تحقیقی ریاضت کے باوجود نظر ثانی کا محتاج ہے کیوں کہ بعض شعراء کی غالب سے نسبت تلمذ اور بعض کی نسبت بدایوں متحقق نہیں ہوسکی ہے۔

اس کے بعد مصنف نے ''غالب سے تلمذ کا غلط انتساب'' کے موضوع پر مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے تین شعراء کا ذکر کیا ہے:

۱-علی احمد خاں اسیر (م ۱۹۲۷ء): ان کا مولد بریلی تھا جہاں وہ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔والد کا نام جنگ باز خاں تھا۔فارسی کی تعلیم مولوی ہدایت علی فاروقی بریلوی (م۱۹۰۴ء) سے حاصل کی جو مولانا فضل حق خیرآبادی (م۱۸۶۱ء) کے شاگرد تھے (خمخانۂ جاوید، ج۱،ص ۳۰۷)۔وہ بدایوں کے تحصیلی اسکول میں ٹیچر تھے۔آگرہ میں بھی ملازمت کی۔متقاعد ہونے کے بعد بدایوں میں مقیم ہوگئے۔ان کے بدایوں میں قیام کے حالات مصنف کی کتاب ''شعرائے بدایوں دربار رسول ؐمیں'' (ص ۲۷) سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ضیاء القادری بدایونی (م۱۹۷۰ء) اورنظامی بدایونی (م ۱۹۴۷ء) نے ان کو غالب کا شاگرد لکھا جو غلط ہے۔وہ ابتداء دلدار علی مذاق بدایونی (م۱۸۹۴ء) سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔

۲-رکھی چندر رسا عرف رام دیال (م۱۸۸۰ء): ان کو ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی (م۲/ دسمبر ۲۰۱۰ء) نے اپنے مضمون مشمولہ پگڈنڈی امرتسر جنوری ۱۹۶۱ء میں غالب کا شاگرد بدون حوالہ

بتایا ہے۔ظاہر ہے کسی کے کہنے سے کوئی کسی کا شاگرد نہیں ہوتا۔خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ دعویٰ کی تردید میں شواہد ملتے ہیں۔رسالہ دیوان ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا تھا جس سے غالب سے تلمذ کا ثبوت نہیں ملتا۔اس کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔راقم الحروف کی رائے میں اس ناواقفیت کی بنا پر کہ وہ کس کے شاگرد تھے، ان کو غالب کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔

۳-چودھری اصغر علی ضابطؔ (م۱۸۹۲ء): آفتاب احمد جوہر بدایونی (م۱۹۸۱ء) نے عرفان زیدی کے مرتبہ ''میخانۂ جامی'' (۱۹۷۰ء) کے مقدمے میں ان کو غالب کا شاگرد لکھا ہے۔ مصنف نے اطلاع دی کہ ضابطؔ کا دیوان معروف بہ ''نغمۂ بہار'' (۱۳۰۳ھ) وکٹوریہ پریس بدایوں سے ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں طبع ہوا جس میں ان کے تلمیذ غالب ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ وہ کس کے شاگرد تھے۔لہٰذا رکھی چندرساؔ کی طرح ان کو بھی غالب سے منسوب کر دیا گیا۔

باب دوم کے تیسرے حصہ کا عنوان ہے ''غالب کے تلامذہ کے تلامذہ''۔اس مقالے میں مصنف نے جن بدایونی شعراء کو پیش کیا ان کے اسماء ہیں ۱-محمد عبدالعزیز سہسوانی (م۱۸۹۹ء) تلمیذ محمد اشرف شروانی۔۲-مولوی امام الدین تلمیذ شیفتہؔ۔۳-عبدالحیٔ بیخودؔ (م۱۹۱۲ء) تلمیذ حالیؔ۔ ۴-محمد مجاہد الدین ذاکرؔ (م۱۹۱۶ء) تلمیذ شیفتہؔ۔۵-انصار حسین زلالیؔ (م۱۹۲۴ء) تلمیذ حالیؔ۔ ۶-صابر حسین سہسوانی (م۱۸۹۶ء) تلمیذ مولوی نجف علی خاں نجف۔۷-حکیم سعید الدین کاملؔ (م۱۸۹۸ء) تلمیذ زین العابدین خاں عارف۔۸-نظام الدین ناطقؔ (م۱۸۶۸ء) تلمیذ الٰہی بخش خاں معروف۔۹-نظام الدین حسین نظامی (م۱۹۴۷ء) تلمیذ حالیؔ۔ان شعراء کو پیش کرنے کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ غالب کے اسلوب شاعری کی بدایوں میں کس حد تک توسیع ہوئی۔اگر غالب کا مخصوص رنگ سخن ان کے تلامذہ کے ذریعہ ان کے تلامذہ کو منتقل ہوا تو یہ مطالعہ بامقصد ورنہ محض زیب داستان۔مصنف کو اس زاویے سے بھی بحث کرنی چاہیے تھی۔

کتاب کا تیسرا باب ہے ''بدایوں اور غالب کے مکتوب الیہم''۔اس باب میں مصنف نے حکیم غلام نجف خاں۔حکیم ظہیر الدین احمد خاں۔مولوی عزیز الدین صادق۔منشی سخاوت

حسین مدہوش۔ حکیم سید احمد حسن مودودی فدا۔ نواب میر ابراہیم علی خاں وفا۔ نواب محمد زکریا خاں زکی اور قطب الدولہ کو شمار کیا ہے۔ اس فہرست میں عزیز الدین صادق، سخاوت حسین مدہوش، حکیم سید احمد حسن مودودی فدا اور نواب محمد زکریا خاں زکی پر گزشتہ سطور میں اظہار خیال کیا جاچکا ہے۔ محمد قطب علی خاں قطب الدولہ سہسوانی کے دو فارسی خطوط کا ذکر ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے شاگرد اور داماد محبوب حسین خاں نے سہسوان میں دھرپد، بین اور خیال گائیکی کو فروغ دیا اور ان کے فرزند عنایت حسین خاں نے ریاست رام پور میں شہرت حاصل کی (ص۱۸۴)۔ لہٰذا ان مکتوب الیہم پر مزید گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ دراصل حکیم غلام نجف خاں اور حکیم ظہیر الدین احمد خاں کے حالات و کوائف ہی اس باب کا اصل حصہ ہیں جن پر مصنف نے غیر معمولی دیدہ ریزی کی ہے۔

حکیم غلام نجف خاں کے نام غالب کے ۲۷ خطوط ملتے ہیں جن سے بقول مصنف ''غالب کے تعلق خاص اور دونوں کی ذاتی زندگی پر بھی چند اہم اشارے ملتے ہیں'' (ص۱۳۶)۔ اس کے بعد مصنف نے ان کے خطوط پر تحقیقی نظر ڈالی ہے جن میں خط نمبر ۹ مکتوبہ ستمبر ۱۸۵۸ء کے متعلق بتایا کہ یہ خط فی الواقع حکیم غلام نجف خاں کے نام ہے (ص۱۶۳) اور مالک رام کا اس خط کے انتساب پر شبہ کا اظہار درست نہیں (ص۱۴۲)۔ مصنف کی جانب سے یہ اہم دریافت ہے۔ اس کے بعد مصنف نے حکیم نجف خاں کے حالات کو یکجا کر کے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کے پیش نظر جو منابع رہے ان کی مختصر کیفیت یہ ہے:

۱- وہ کتب جن میں دہلی کی اہم شخصیات کا ذکر ملتا ہے۔ آثار الصنادید، واقعات دار الحکومت دہلی، دہلی کی یادگار ہستیاں وغیرہ۔ ۲- طب یونانی کے تذکرے۔ ۳- غالب کے مکتوب الیہم پر تعارفی نوٹ جیسے ادبی خطوط غالب وغیرہ۔ ۴- خاندانی افراد کی بیاضیں اور مطبوعہ مضامین، مولانا برکات احمد ٹونکی (م ۱۹۲۸ء)۔ سید محمود احمد برکاتی اور وحید احمد مسعود بدایونی (م ۱۹۷۷ء) کے مضامین، ۵- مصنف کے اپنے دریافت کردہ منابع۔ جواہر فریدی فارسی از محمد اصغر علی فتح پوری (۱۹۵۳ء)۔ عروج شیخو پور فارسی قلمی از شیخ فتح الدین (۱۸۵۲ء)۔ نواب فرید از سلطان حیدر جوش (۱۹۱۷ء)۔ شیخو سے شیخو پور تک از تسلیم غوری (۱۹۹۵ء)۔

شیخ وحید اور مسعود نظامی (م ۱۹۷۷ء) حکیم نجف علی خاں کے ہمشیرہ کے پوتے تھے۔

انہوں نے بدون حوالہ نجف خاں کا سال ولادت ۲۴؍شعبان ۱۲۲۴ھ/۵؍اکتوبر ۱۸۰۸ء تحریر کیا ہے۔مصنف نے اشارہ کیا کہ غلام نجف سے ۱۲۰۴ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں جو قیاساً ان کا سال ولادت ہوسکتا ہے۔ جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ دونوں تاریخوں میں ۲۰ سال کا فصل ہے۔ خاندانی روایت کے مطابق ان کی شادی ۱۸۳۸ء میں ہوئی۔اس وقت ان کی عمر ۲۶ سال کی تھی جو قرین قیاس ہے ورنہ تاریخی نام سے یہ عمر ۴۶ سال ہوگی جو بعید از قیاس ہے۔لہٰذا شیخ وحید احمد مسعود کی بیان کردہ تاریخ درست ہے۔مصنف نے ان کے والدین، ذریعۂ معاش اور مناصب وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔محمود احمد برکاتی نے ان کا سال وفات ۸۱ سال کی عمر میں ۱۸۸۹ء تحریر کیا۔جو صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ تاریخی نام سے عمر ۱۰۱ سال ہوئی جو صحیح نہیں۔الحاصل غلام نجف خاں کی پیدائش ۲۴ شعبان ۱۲۲۴ھ/۱۵؍اکتوبر ۱۸۰۸ء اور وفات بہ عمر ۸۱ سال ۱۸۸۹ء قابل قبول ہے۔ان کی تدفین قدم شریف دہلی میں ہوئی۔(ص ۱۵۱)

قاضی عبدالودود (م ۱۹۸۴ء) نے حکیم غلام نجف خاں کو شاعر تسلیم نہیں کیا اور وجہ یہ بتائی کہ ان کا شاعر کی حیثیت سے ذکر نہیں ملتا۔اس کے جواب میں ڈاکٹر حنیف نقوی کی یہ دلیل کہ ''ہمارے نزدیک شاعر کی حیثیت سے کسی شخص کا کہیں ذکر نہ آنا ہرگز اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ شعر گوئی کی قدرت نہیں رکھتا'' کسی حد تک درست ہے۔البتہ شعر گوئی کی قدرت اور شعر گوئی میں نازک فرق ہے۔راقم الحروف کی نظر میں حکیم غلام نجف خاں شاعر تھے اور غالب کے شاگرد بھی۔اس کا ثبوت وہ منظوم اشتہار ہے جو پنج آہنگ کے پہلے ایڈیشن پر اسعد الاخبار آگرہ میں ۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء کو شائع ہوا تھا۔پنج آہنگ کی تصحیح غلام نجف خاں نے کی تھی تو ان کے تحریر کردہ اشتہار سے انکار کیوں؟ غالب نے تصحیح شدہ پنج آہنگ اور منظوم اشتہار کو قبل از طباعت بہ نظر اصلاح ضرور دیکھا ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ وہ غالب کے طرز میں ہے۔اس کے علاوہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں کہ شاعر کے اشعار کا اس کے استاذ کے رنگ سخن میں ہونا اس کے تلمذ کی نفی کرتا ہے۔

حکیم غلام نجف خاں کو غالب سے بے پناہ عقیدت تھی۔مصنف نے اس عقیدت کے ثبوت میں موضع غالب پٹی کو دریافت کیا (نقشہ ص ۱۵۶ پر) جس کو حکیم غلام نجف خاں نے بدایوں میں میران سرائے اور شیخو پور کے مابین معظم پور میں غالب سے منسوب کیا تھا۔اس دریافت سے

خود مصنف کی تحقیقی جستجو کا ثبوت ملتا ہے۔ بدایوں میں غالب پٹی کی دریافت مطالعہ غالب میں ایک اضافہ ہے۔

مصنف نے حکیم محمود احمد برکاتی کے حوالے سے حکیم غلام نجف خاں کے طب کے موضوع پر تین رسائل اور ایک یادداشت کو متعارف کرایا ہے۔ مصنف نے اطلاع دی کہ حکیم غلام نجف خاں کا فن طب میں تعلق خاندان بقائی سے تھا اور وہ اس خاندان کے سند یافتہ تھے۔ ان کا خاندان بقائی سے نسبی سلسلہ نہیں تھا جیسا کہ حکیم سید ظل الرحمٰن کو مغالطہ ہوا۔ (ص ۱۵۵)

مصنف نے غالب کے مکتوب الیہم کے سلسلے میں حکیم غلام نجف خاں کے فرزند حکیم ظہیر احمد خاں کو بھی شامل کیا ہے۔ ان کے دو خطوط اور غالب سے تعلق کا ذکر کیا ہے۔ غالب ان کو اپنے پوتے کی طرح مانتے تھے اور غالب کی اہلیہ ان سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ مصنف نے اس موقع پر قاضی عبدالودود کے اس گمان کی تردید کی ہے کہ حکیم غلام نجف خاں اور حکیم ظہیر الدین خاں کا غالب سے خونی رشتہ ہوسکتا ہے۔ مصنف نے حکیم ظہیر الدین کے تیسرے خط سے بھی انکار کیا جس کو خلیق انجم نے علاحدہ شماریاتی نمبر دیا ہے دراصل یہ خط نمبر ۲ کی ہی عبارت ہے جو عود ہندی میں محذوف کردی گئی تھی (ص ۱۵۹)۔ مصنف نے اس مقالے میں تفضّل حسین نام کے چار افراد کا تعارف کرانے کے بعد مطلوبہ تفضّل حسین کوکبؔ (م ۱۸۷۳ء) کو تلاش کیا اور ثابت کیا کہ وہ حکیم غلام نجف خاں کے داماد اور حکیم ظہیر الدین احمد خاں کے بہنوئی تھے۔ وہ غالب کے شاگرد اور ریاست الور میں نائب دیوان کے عہدے پر فائز تھے۔ اسفند یار بیگ کی سازش سے جب ریاست الور کے دیوان منشی امین الدین خاں عرف امّو جان کو دہلی واپس آنا پڑا تو وہ بھی ان کے ساتھ دہلی آ گئے۔ تفضّل حسین کوکبؔ امو جان کے بھتیجے تھے۔ غالب کا حکیم نجف خاں کے نام خط نمبر ۹ جس کے متعلق مالک رام نے لکھا تھا کہ وہ ان سے غلط منسوب ہوگیا ہے (ص ۱۴۲)۔ دراصل حکیم غلام نجف خاں کے ہی نام ہے جس میں واقعہ الور پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں مصنف کو قدم قدم پر نزاعی امور کا سامنا کرنا پڑا اور شواہد کی روشنی میں صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی سعی کی۔ آخر میں امراؤ بیگم زوجہ غالب کی تنخواہ کا مسئلہ۔ مصنف نے اس موقع پر ڈاکٹر حنیف نقوی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا کہ لوہارو اسٹیٹ سے ۳۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ جو امراؤ بیگم کو ملتی تھی

وہ نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی کے بعد ریاست کے نظم جدید کے تحت ۵۰ روپے ماہانہ کردی گئی تھی۔ (ص ۱٦٦)

مصنف نے حکیم ظہیر الدین احمد خاں کے خطوط اوران کے غالب سے تعلق پر دیدہ ریزی سے گفتگو کرنے کے بعد ان کی ولادت، تعلیم و تربیت، طبی مہارت، قومی خدمت، اعزازات، شادی اور اولاد کا ذکر کیا ہے۔ دستیاب حقائق کو جانچنے کے بعد ان کی پیدائش کا سال ۱۸۴۷ء طے کیا لیکن تاریخ وفات لامعلوم رہی۔ شمس بدایونی کی رائے میں ان کی وفات ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ یہ قیاس بے بنیاد نہیں ہوسکتا کہ بیٹے کی تاریخ وفات کو سہواً باپ کی وفات سے منسوب کردیا جائے۔ اس موقع پر عبدالسلام خاں رام پوری نے غلام نجف خاں کی جو تاریخ وفات ۱۹۲۴ء درج کی، وہ ان کے صاحبزادے ظہیر الدین احمد کی ہوسکتی ہے (ص ۱۵۱)۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۷۷ سال کی ہوئی جو نامناسب نہیں ہے۔

اس کے بعد مصنف نے ان افراد بدایوں کا مختصر تعارف کرایا ہے جن کا ذکر غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ یہ کام بھی دیدہ ریزی کا تھا کیوں کہ غالب کے جملہ خطوط کا مطالعہ کیے بغیر مضمون مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ مصنف نے اس مضمون میں ۱۱۴ افراد بدایوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ ان میں بعض کا تعارف غالب کے مکتوب الیہم کے ضمن میں ہو چکا اور بعض کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ ان میں مولوی اساس الدین (م ۱۸۲۸ء) اور شیخ نجم الدین حیدر پر مضامین نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ محمد حمید الدین۔ قاضی فصیح الدین بدایونی اور مولوی شاہ فضل رسول پر مضامین اس اعتبار سے اہم ہیں کہ مصنف نے ان کے متعلق نزاعی حقائق کو واضح کرکے صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال میں محمد حمید الدین کی شناخت کا مسئلہ۔ غالب کے فارسی قطعے میں جس کو پروفیسر نثار احمد فاروقی نے انجمن محمدیہ آگرہ کے کتب خانے میں مجموعہ مثنویات کی ایک جلد میں ''کلیات نظم غالب'' کے اوراق سے برآمد کیا، اس میں کسی محمد حمید الدین کی وفات پر یہ شعر شامل تھا ؎

سید الانبیاء شفیع اش باد کاں سعید ازل زعترت اوست

ایوب قادری نے اپنی تالیف ''غالب اور عصر غالب'' میں مصرعہ ثانی میں عزت اور فاروقی نے اپنی تالیف ''تلاش غالب'' میں عشرت پڑھا۔ مصنف نے پہلے مصرعے کی رعایت سے

اس کو عترت پڑھا اور عزت/عشرت کو کتابت کی غلطی تسلیم کیا۔ اس کے بعد مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ محمد حمید الدین حکیم غلام نجف خاں کے چھوٹے بھائی نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ نسلاً فاروقی تھے جب کہ قطعہ کسی سید حمید الدین کی وفات پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے غالب اور بدایوں کی اس راست جہت کی تکمیل ہو جاتی ہے جس کا تعلق غالب کے تلامذہ، تلامذہ کے تلامذہ، مکتوب الیہم اور افراد بدایوں سے تھا۔ مصنف کے مطالعے اور ژرف بینی کی داد نہ دینا ناسپاسی ہوگی۔

مصنف نے باب چہارم کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱- دیوان غالب نسخۂ بدایوں، ۲- دیوان غالب نظامی ایڈیشن، ۳- نکات غالب، ۴- تحریک مزار غالب، ۵- غالبیات اور نظامی پریس۔ مصنف کی کتب، نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات (۱۹۹۵ء) اور مزار غالب (۲۰۱۱ء) طبع ہو چکی ہیں جن سے رجوع کرنا چاہیے۔ یہ تمام کام مطالعہ غالب میں، بدایوں کے حوالے سے، ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اب اس فہرست میں دیوان غالب نسخۂ بدایوں اور نکات غالب باقی رہے جن پر گفتگو کرنا مناسب ہوگا۔

مصنف نے دیوان غالب نسخہ بدایوں ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء پر مدلل بحث کے بعد یہ ثابت کیا کہ وہ محمد ذوالفقار الدین کی ملکیت تھا۔ محمد ذوالفقار الدین حکیم نجف خاں کے چچا شیخ فتح الدین کے فرزند اور بدایوں کے سر برآوردہ اشخاص میں تھے۔ عرشی رام پوری نے اس کو متعارف کرایا اور مقدمہ دیوان غالب نسخۂ عرشی طبع دوم میں شامل کیا۔ یہ نسخہ جو احید الدین نظامی (م ۱۹۷۳ء) فرزند نظام الدین حسین نظامی کو کہیں دستیاب ہوا تھا اور عرشی صاحب کو دکھایا تھا، احید الدین نظامی کے فرزند جمال الدین مونس نظامی کی تحویل میں آیا۔ جمال الدین مونس (م ۷/نومبر ۲۰۰۶ء) نے پاکستان جا کر اس کو مبلغ چار ہزار میں فروخت کر دیا۔ مونس نظامی کی یہ حرکت ناروا تھی۔ نسخے کے خریدار ہندوستان میں بھی مل جاتے۔ اس کی مائکروفلم کاپی ہی تیار کروا کے محفوظ کر لی ہوتی۔ اب یہ نسخہ نیشنل میوزیم اسلام آباد (پاکستان) کی زینت ہے جہاں ابھی تک اس کی اشاعت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

نظام الدین حسین نظامی بدایونی (م ۱۹۴۷ء) نے مرزا غالب کے خطوط جو عود ہندی (۱۸۶۸ء) اور اردوئے معلّٰی (۱۸۶۹ء) میں ملتے ہیں ان سے مرزا غالب کی نجی زندگی اور فن

سے متعلق موازنہ کر کے نکات غالب کو مرتب کیا جس کے تین ایڈیشن ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئے۔ مصنف نے اس کتاب کا مفصل تعارف کراتے ہوئے تحریر کیا کہ ''اس وقت غالب پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی ...... اس نے اہل قلم کے لیے ایک نئی راہ تالیف کی نشاندہی کی۔ اس لیے وہ اولیت کی مستحق ہے''۔ (ص ۲۱۶-۲۱۷)

کتاب کے باب پنجم کا عوان ہے ''بدایوں میں غالب کا احتساب و موازنہ'' جس کے تین ضمنی عنوانات ہیں: ۱- بہترین غزل گو، ۲- تبصرہ، ۳- مومن و غالب۔

۱- بہترین غزل گو: از قلم قاضی غلام امیر صاحب امیرؔ بدایونی (م ۱۹۴۳ء)۔ اصلاً یہ عنوان ''موازنہ ذوق و غالب'' (۱۹۲۶ء) وجود میں آیا اور بعد کو بہترین غزل گو کے عنوان سے ''الناظر'' پریس لکھنؤ سے جون ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔

۲- مومنؔ و غالبؔ: از قلم سید اعجاز احمد معجزؔ سہسوانی (م ۱۹۶۳ء) مطبع نظامی فیض آباد (۱۹۳۱ء)۔

۳- تبصرہ بر کتاب مومن و غالب: از قلم شاکر حسین نکہت سہسوانی (م ۱۹۵۳ء)۔ مذکورہ بالا تینوں افراد غالب کے محتسب اور موازنہ کار تھے۔ تینوں ہی علوم شرقیہ کے منتہی اور اردو فارسی عربی زبانوں پر عالمانہ قدرت کے حامل بھی۔ انہوں نے غالب کا ذوق (م ۱۸۵۴ء) اور مومن (م ۱۸۵۱ء) سے موازنہ کرنے کے بعد غالب کے معیار شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں انہوں نے اپنے اصول نقد بھی متعین کیے اور غالب کے بعض ناقدین جیسے عبدالرحمٰن بجنوری (م ۱۹۱۸ء) اور غالب کے شارحین جیسے نظم طباطبائی (سید حیدر علی متوفی ۱۹۳۳ء) کے بلند و بالا مطالب کی گرفت بھی کی۔

مصنف نے مذکورۂ بالا ناقدین کے اصول نقد پر تبصرہ کرتے ہوئے دیگر نکات کے علاوہ یہ سوال بھی قائم کیا کہ غزل کا صنفی بنیاد پر موازنہ کیوں نہیں کیا جا سکتا اور غالب کی شاعری پر گفتگو کرتے وقت ان کے مکاتیب کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟ (ص ۲۵۱-۲۵۲) اس بحث میں مصنف کی یہ رائے قابل قبول ہے کہ ''ان تحریروں میں غالب کا رد نہیں کیا گیا بلکہ سنجیدگی کے ساتھ غالب کے کلام کا موازنہ مومن و ذوق کے کلام سے کر کے، غزل کے روایتی جائزے اور حالی و بجنوری و شارحین غالب کے بیانات کی روشنی میں منطقی استدلال کے ساتھ تجزیاتی عمل سے

گزر کر ایک واضح نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان تحریروں سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف لیکن مطالعہ غالب کے سلسلے میں ان مصنّفین کی سنجیدہ علمی کوشش کے اس عمل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا''۔(ص۲۴۰) راقم الحروف کی رائے میں مذکورہ کتب کو نظر ثانی اور دستیاب معلومات کی روشنی میں شائع کرادیا جائے۔وجہ صاف ہے۔یہ رسائل عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں کیونکہ ان کے محققین معقولات و منقولات کے فقہی اور معتزلی فکر و نظر سے غیر متاثر بھی ہیں۔یہ کتب آئینہ غالب کی پشت پر زنگار کا کام کرتی رہیں گی۔

باب ششم کا عنوان ہے''بدایوں میں غالب شناسی''۔مصنف نے اس سلسلے میں تین نام درج کیے ہیں:

۱-نظام الدین حسین نظامی بدایونی (۱۸۷۲ءتا۱۹۴۷ء)،۲-پروفیسر آل احمد سرور (۱۹۱۱ءتا ۲۰۰۲ء)، پروفیسر حنیف نقوی (پیدائش ۱۷/۱اکتوبر۱۹۳۶ء)۔مصنف نے باب چہارم میں نظام الدین حسین نظامی بدایونی، نظامی پریس اوران کے اخبار ذوالقرنین پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی لہٰذا اب اس کی تکرار ضروری نہیں۔اس وقت اتنا اشارہ کافی ہے کہ غالب اور بدایوں کے تعلق سے نظامی بدایونی پہلے فرد ہیں جنہوں نے بدایوں میں غالب شناسی کا آغاز کیا اور جس سے بیرون جات کے غالب شناس بھی مستفید ہوئے۔آخری نام پروفیسر حنیف نقوی کا ہے۔آں موصوف کو غالب کے حالات حیات، ان کی فارسی تحریروں، اردو شاعری اور خطوط سے گہری واقفیت ہے۔انہوں نے غالب کے متعلق نئے حقائق دریافت کیے اور محققین غالب کی تحقیقات کا احتساب بھی کیا۔غالب پر ان کے تحقیقی کام میں انفرادیت کی جھلک ہے۔مالک رام (م۱۹۹۳ء)، پروفیسر نذیر احمد (م۲۰۰۸ء) اور مختار الدین احمد آرزو (م۲۰۱۰ء) کے انتقال کے بعد ان کا نام سرفہرست ہے۔مصنف نے اس مضمون میں ان کے جملہ تحقیقی کام کا جائزہ لے کر یہ صحیح رائے دی کہ وہ''محققوں کے محقق بن کر ابھرے ہیں''(ص۳۰۴)۔بدایوں میں غالب شناسی کے سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور کو درمیانی کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔مصنف نے پروفیسر آل احمد سرور کی غالب اور غالبیات کے حوالے سے کم و بیش چالیس تحریروں کی نشاندہی کی اور باب ہفتم میں ایک اشاریہ پیش کیا (ص۳۴۶)۔مصنف نے مطلع کیا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے پہلا مضمون بعنوان''غالب''۱۹۴۱ء میں اور آخری

مضمون بہ عنوان ''ہندوستانی نشاۃ الثانیہ اور غالب'' ۱۹۹۱ء میں تحریر کیا تھا گویا انہوں نے کم و بیش نصف صدی غالب کے مطالعے میں گزاری اور موقع بہ موقع غالب پر اظہار خیال کرتے رہے۔ مصنف نے ان کے مضامین سے مختصر اقتباسات درج کر کے ان کے ''بیشمار پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے'' اور ان کے مجموعی ''نقطۂ نظر'' پر روشنی ڈالی ہے (ص ۳۷۴)۔ اس عمل سے مصنف کی سرور سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف کا سالم کام اعلیٰ تحقیق و تنقید کا نمونہ ہے۔

اس وقت اتفاقی طور پر یہ لکھنا بے محل نہیں ہوگا کہ پروفیسر آل احمد سرور کی کم و بیش دو درجن مطبوعہ کتب میں ایک بھی مستقل تصنیف، غالب پر نہیں ہے جب کہ تنہا اقبالؔ پر چھ کتب ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں آل احمد سرور غالب شناس کم اور اقبالؔ شناس زیادہ نظر آتے ہیں۔ اس کمی و بیشی کے مدنظر سرور کی غالب شناسی پر اقبال شناسی کو ترجیح دینا پڑے گی۔

مصنف نے تحریر کیا ہے ''سرور صاحب کے اسلوب میں غضب کی ذہانت پوشیدہ ہے۔ ان کو بڑی باتیں چھوٹے الفاظ و سطور میں کہنے کا ملکہ ہے۔ انہوں نے نثر میں ایمائیت، اشاریت اور ظاہری و معنوی لفظی بازی گری سے بھی کام لیا۔ کبھی کبھی قاری ان کی نثر کے رومان میں اصل موضوع و فکر کو بھول جاتا ہے (ص ۳۷۰)۔ اس کے فوراً بعد ہی مصنف نے یہ عذر پیش کیا ''یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا قاری اسلوب کے نشاط کی وجہ سے تنقید کی خشکی میں خود خشک نہیں ہوتا''۔ (ایضاً)

یہ بات غور طلب ہے کہ آل احمد سرور نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک شاعر کی حیثیت سے کیا۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''سلسبیل'' ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد دو مجموعے ''ذوق جنوں'' اور ''خواب اور خلش'' (۱۹۹۱ء) شائع ہوئے۔ گویا ان کی شاعری نصف صدی سے زیادہ مدت تک ان کے اعصاب پر سوار رہی۔ اس کے علاوہ یہ بھی غور طلب ہے کہ آل احمد سرور نے اولاً ایم اے انگریزی کی سند حاصل کی اور ملازمت کا آغاز بھی ۱۹۳۴ء میں انگریزی لکچرر کی حیثیت سے کیا۔ لہٰذا یہ امر یقین کی حد تک درست ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ادبیات انگریزی کے مشاہیر اہل قلم کا مطالعہ کیا اور ان کے اسلوب کی ذہانت اور برجستگی کو شعری نشاط کے ساتھ اپنی نثر میں پیش کیا۔ لہٰذا اس حقیقت کے اعتراف میں تامل کیوں ہے کہ وہ ناقدانہ بصیرت کے ساتھ ایک منفرد اسلوب نگارش کے حامل نثر نگار بھی تھے۔

باب ہفتم کا عنوان ہے ''بدایوں کے ادب پر غالب کے اثرات''، مصنف نے اس باب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱-''روایت غالب کا اثر ونفوذ''، مصنف نے اس مضمون میں شعرائے بدایوں کے کلام میں غالب کے اثر ونفوذ کو تلاش کیا ہے۔ان میں دو شاعر بہر حال غالب کے زیر اثر دکھائی دیتے ہیں۔شوکت علی خاں فانی (م ۱۹۴۱ء) اور دلاور فگار (م ۱۹۹۸ء)۔ بقول مصنف ''فانی کے یہاں گہری داخلیت اور بلیغ معنویت غالب ہی کا عطیہ ہے۔ان کی غزل کی پر تفکر فضا، معنی کی تہ داری، فکر وبصیرت کی نئی جہتیں، غم کی باوقار کیفیتیں، انداز بیان کی متانت اور غلو، غالب سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے''۔(ص ۳۱۰) مصنف نے دلاور فگار کے متعلق تحریر کیا ''دلاور فگار صرف لفظوں سے نہیں بلکہ خیال سے ابھرنے والے مزاح سے قریب تر ہیں اور یہ وصف خاص غالب کا ہے۔انہوں نے غالب کی فکر اور اسلوب سے وافر استفادہ کیا ہے۔غالب پر مستقل نظمیں لکھنے کے علاوہ، انہوں نے غالب کے معروف مضامین، اشعار، تراکیب کو اپنی شاعری میں سمو کر ان کی ادبی لطافت کو ظرافت میں بدل دیا ہے۔یہی نہیں غالب کے اشعار اور مصرعوں میں تحریف کر کے ان کے معانی کو وسعت اور انسانی واقعات پر ان کی مزاحیہ تطبیق کی ہے، صرف چند شعر مثال میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

باپ سیلاب فنا میں بہہ گئے　　ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

نہ مجھ کو اتنے غم ہوتے نہ میں اتنا بڑا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ڈیڈی نے نہ یہ ہوتے تو کیا ہوتا　　(ص ۳۱۹ تا

داغ فراق دعوت شب کا بچا ہوا　　ہے ایک کوفتہ جو مرا ٹارگیٹ ہے　　۳۲۱)

اس کے بعد مصنف نے بدایوں کے نثر نگاروں پر غالب کے اثر ونفوذ کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں نظامی بدایونی تلمیذ حالی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا کہ ''نظامی کو جو کچھ حاصل ہوا وہ فیضان غالب ہی کے زیر اثر آتا ہے'' (ص ۳۲۱)۔مصنف نے نظامی بدایونی کے بعد میر محفوظ علی (م ۱۹۴۳ء) کے متعلق تحریر کیا کہ ''ان کا نثری کام بیشتر طنز ومزاح تک محدود ہے لیکن ان کے یہاں معنوی تہ داری، متانت آمیز شوخی اور اسلوب میں شگفتگی ملتی ہے۔اسے غالب کا فیضان کہنا صحیح ہوگا''۔(ایضاً)

۲- ''غالب کے اشعار سے مطبوعات کے نام'' کے زیر عنوان مصنف نے خلیل الرحمٰن اعظمی (م ۱۹۷۸ء) کے مضمون ''یک عمر ناز شوخی عنواں اٹھایئے'' (مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء) سے اخذ کر کے ایسے مصنّفین بدایوں اور ان کی کتب کے اسماء درج کیے ہیں جو اشعار غالب سے ماخوذ ہیں۔ مصنف نے اس سلسلے میں رائے دیتے ہوئے تحریر کیا ''اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ غالب سے حاصل کردہ ناموں کے زمرے میں صرف وہی نام جگہ پاسکتے ہیں جو غالب کی خاص اپنی وضع کردہ دولفظی و سہ لفظی تراکیب یا مصرعے کے کسی ایک جزو پر مشتمل ہوں یا پھر مصنف نے صراحت کردی ہو کہ وہ کلام غالب سے ماخوذ ہے'' (ص ۳۳۵)۔ اس ضمن میں بدایونی شعراء میں اختر انصاری (م ۱۹۸۸ء)، عروج زیدی (م ۱۹۸۷ء) اور دلا ور فگار کے اسماء پیش کیے گئے ہیں۔

۳- اس مضمون کا عنوان ہے ''منظوم خراج عقیدت''۔ مصنف نے اس مضمون میں ان شعرائے بدایوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے غالب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ مصنف نے اعتراف کیا کہ وہ ان منظومات کا اشاریہ نہیں بنا سکا (ص ۳۳۷)۔ راقم الحروف کی رائے میں غالب کو منظوم خراج عقیدت سے زیادہ اہم ان تضمینوں کی تلاش و ترتیب ہے جو غالب کے اشعار پر وجود میں آئیں کیونکہ وہ بھی سرمایۂ ادب ہیں۔

۴- اس مضمون کا عنوان ہے ''بدایونی اہل قلم کی غالب پر کتب و مضامین کا اشاریہ''۔ راقم الحروف کی نظر میں یہ مضمون باب ہفتم کا ہی نہیں پوری کتب کا اہم ترین باب ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدایوں کے جسم میں غالب کی شریانیں ہر کروٹ ہر پہلو دوڑ رہی ہیں، کہیں بھی کوئی حصہ خالی نہیں ہے۔ اس مضمون کو مرتب کرنے میں خود مصنف کو کتنی ریاضت کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ صرف وہی افراد کر سکتے ہیں جو اس طرح کے کام کا تجربہ رکھتے ہیں۔ مصنف نے اس بکھرے ہوئے مواد کو سلیقے کے ساتھ مرتب کر کے اپنی سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس مضمون کی درجہ بندی اس طور پر ہے:

۱- غالب تذکروں میں۔ ۲- غالب کی تصانیف۔ ۳- غالب اور متعلقات غالب پر تصانیف و مقالے۔

تیسرا حصہ بہت اہم ہے جس میں مصنف نے الف بائی ترتیب کے ساتھ مصنّفین و مقالہ نگاروں کے مضامین کی فہرست درج کی ہے۔ البتہ پروفیسر آل احمد سرور کی تحریروں کو کئی وضاحتی عنوانات میں تقسیم کر کے فہرست کو بسیط طور پر پیش کیا ہے کیونکہ مصنف کی نظر میں پروفیسر آل احمد سرور کی تحریروں کو مطالعۂ غالب میں کلیدی حیثیت حاصل ہے اور وہ مقبولیت کے دائرے سے نکل کر عظمت کے دائرے میں آچکی ہیں (ص ۳۴۱)۔ مصنف نے غالب کے حوالے سے اپنی مطبوعہ کتب اور مضامین کا اشاریہ بھی درج کیا ہے جن کی تعداد ۲۷ ہے (ص ۳۵۵ - ۳۵۷) جس سے معلوم ہوا کہ مصنف غالبیات کے میدان میں نو وارد نہیں ہے۔ اس کا سفر ۱۹۸۱ء میں ''غالب بدایوں میں'' مضمون سے شروع ہوا جو اس کی کتاب ''دید و دریافت'' (اعلیٰ پریس دہلی ۱۹۸۱ء) میں شامل ہے۔ مصنف نے استدراک میں اپنے ان سات مقالوں کو شامل کیا ہے (ص ۳۶۳) جو ستمبر ۲۰۱۰ء تک شائع ہوئے تھے۔ گویا ان کی مطبوعہ کتب اور مقالات کی کل تعداد ۳۴ ہوئی جو ان کو غالب شناسوں کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے کافی ہے۔

۵- باب ہفتم کے آخری مضمون کا عنوان ہے ''صد سالہ جشن غالب بدایوں''۔ یہ جشن ۱۹۶۹ء میں منایا گیا تھا۔ اس وقت مصنف کی عمر ۸ سال کی تھی۔ ظاہر ہے مصنف نے اس جشن میں شرکت نہیں کی اس کے باوجود مصنف نے ''جشن صد سالہ کمیٹی'' کے ممبران اور اس کے زیر اہتمام دو روزہ پروگرام کی تفصیل درج کی ہے۔ جشن صد سالہ کا افتتاح گورنر یوپی ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے کیا تھا۔ ان کو جو سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا۔ مصنف نے اس کی نقل بھی مضمون میں شامل کر لی ہے۔ یہ مضمون تاریخی اہمیت کا ہے۔ اس مضمون میں صد سالہ جشن غالب بدایوں کے حالات محفوظ ہو گئے ہیں۔

مصنف نے کتاب کے آخری صفحات میں کتابیات اور اشاریہ شامل کیا ہے جو ہر تحقیقی کتاب کی ضرورت ہے۔ کتاب میں عکس اور تصویریں بھی ہیں۔ تصویریں دھندلی ہیں۔ مصنف نے پروفیسر نذیر احمد (م ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۸ء) کو یاد کیا۔ نامناسب نہیں ہوتا اگر ان کا فوٹو بھی شامل کر لیا جاتا۔ کتاب میں خود مصنف کے فوٹو اور سوانحی حالات و تصنیفات کی فہرست کی کمی محسوس ہوئی۔ ایسے اعلیٰ کام میں کتابت کی اغلاط بہت ہیں۔ کتاب کھولتے ہی ترتیب میں بدایوں کی جگہ بدیوان

پڑھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آیندہ کتاب میں کتنی اغلاط ہوسکتی ہیں۔ تاہم یہ وہ چھوٹی چھوٹی خامیاں ہیں جنہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب اپنی جگہ ایک تحقیقی کارنامہ ہے جس کے لیے مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میں ان کی درازیِ عمر اور توفیق کار کے لیے دعا کرتا ہوں۔

کتاب: غالب اور بدایوں۔

مصنف: ڈاکٹر شمس بدایونی۔

ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی۔

اہتمام: شاہد ماہلی۔

مطبع: اصیلا آفسیٹ پریس دہلی۔

تعداد صفحات: ۴۰۶۔

مبصر: ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب، ۲۷ پھول والان۔ بریلی (یوپی) ۲۴۳۰۰۳۔

محققین غالب کی فہرست میں امتیاز علی خاں عرشی رام پوری (م ۱۹۸۱ء)، اکبر علی خاں عرشی زادہ (۱۹۹۷ء)، مشفق خواجہ (م ۲۰۰۵ء)، مختار الدین احمد آرزو (م ۲۰۱۰ء)، ناقدین غالب میں آل احمد سرور (م ۲۰۰۲ء)۔ سرفہرست ہیں۔ بحمد اللہ جو حیات ہیں ان میں پروفیسر حنیف نقوی (پیدائش ۱۹۳۶ء) اور شمس بدایونی (پیدائش ۱۹۶۱ء) بھی شاعر ہیں۔ ان میں عرشی زادہ، آل احمد سرور اور مشفق خواجہ کا کلام شائع ہوا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر باقی کا کلام بھی شائع ہو جائے۔ آل احمد سرور کے بقول ؎

نوائے شوق میں شورش بھی ہے قرار بھی ہے

خرد کا پاس بھی، خوابوں کا کاروبار بھی ہے

معارف کی ڈاک

انسداد غلامی

پروفیسر شعبہ علوم اسلامی،
جامعہ کراچی۔
۱۵/۱۱/۲۰۱۱ء

مدیر محترم! سلام مسنون

معارف، اگست ۲۰۱۱ء میں مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں میرے اس مقالہ پر خامہ فرسائی کی گئی ہے جو جولائی ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں شامل تھا۔ سب سے پہلے تو میں فاضل تبصرہ نگار کا شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے اسے نقد و نظر کے لائق سمجھا اور بہ نظر استحسان دیکھتے ہوئے بڑا معلوماتی اور پر مغز مقالہ قرار دیا نیز اس جرأت مندانہ اظہار خیال پر ناچیز کو مبارک باد کا مستحق جانا۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ (آمین)

فاضل تبصرہ نگار نے میرے مقالے کے دو نکات کو محل نظر قرار دیا ہے۔

۱۔ قانون مکاتبت کا روایتی مفہوم قرآنی مفہوم سے مختلف ہے۔

۲۔ باندیوں سے نکاح کے بغیر جنسی تمتع کرنا خلاف قرآن ہے۔

محترم تبصرہ نگار نے اول الذکر نکتہ کے جواب میں الف، ب، ج، د کی صورت میں چار نکات پیش کئے ہیں۔ ذیل میں راقم اسی ترتیب سے اپنی وضاحت پیش کرنا چاہتا ہے:

الف) توجہ رہے کہ جب مسلم سماج کے سرکردہ افراد سے کہا جا رہا ہو کہ وہ غلامی کے خاتمے کی تدابیر اختیار کریں اور اس ضمن میں اہل خیر کو غلاموں کی رہائی کے سلسلے میں مالی امداد کے احکام بھی دیے جا رہے ہوں تو سوچئے! کیا یہ احکام خود غلاموں کے مالکوں کے لئے نہیں ہوں گے؟ کیا وہ معاشرے کے سرکردہ لوگوں میں شمار نہیں ہوتے تھے؟ کیا یہ جائے تعجب نہیں کہ معاشرے کے باحیثیت لوگ دیگر غلاموں کی رہائی کے لیے تو قرآنی حکم کے تحت اپنے انفاق کا

مصرف تحریر رقبة (النساء/۹۲۔المائدہ/۸۹۔المجادلہ/۳) فك رقبة (البلد/۱۳۔اور وفی الرقاب (البقرہ/۱۷۷۔التوبۃ/۶۰) کو بنائیں، مگر خود اپنے غلاموں کو رہا کرنا ہو تو بجائے انفاق کرنے کے خود اس سے اس کی قیمت کے طالب بن جائیں گویا کسی غیر کے غلاموں کی رہائی میں تو وہ اپنا مال دل کھول کر خرچ کریں اور جب اپنے غلاموں کی رہائی کا مسئلہ بہ صورت مکاتبۃ درپیش ہو تو انہیں دوسرے اہل خیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور اس طرح غلاموں کے بیچنے کا کاروبار شروع کردیں۔ آخر اٰتوا (النور/۳۳) کے مخاطبین میں معاشرے کے دیگر سرکردہ افراد کے ساتھ خود غلاموں کے آقاؤں کو شامل کرنے میں کیا دشواری ہے؟ کیا اٰتوا کے مخاطین میں آقاؤں کے استثناء کی کوئی صراحت یا اشارت موجود ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے نزدیک بلاشبہ اٰتوا کے مخاطبین میں جہاں سماج کے دیگر باحیثیت لوگ شامل ہیں وہیں خود غلاموں کے باحیثیت آقا بھی بدرجہ اولیٰ اس میں شامل ہیں۔

ب) کتاب یا مکاتبۃ (النور/۳۳) بلاشبہ ایک شرعی اصطلاح ہے مگر اس کے روایتی یا فقہی مفہوم کو شرعی مفہوم سمجھنا ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ شرعی مفہوم تو وہ ہے جو قرآن مجید کے لفظوں سے متبادر ہوتا ہے یعنی مکاتب ہونے والے غلاموں کی مالی امداد کرنا (واٰتوھم من مال اللّٰہ الذی اٰتٰکم۔النور/۳۳) خواہ وہ معاشرے کے اہل ثروت کریں یا خود ان کے آقا۔ اس سے نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا از روئے نص قرآنی یہی مفہوم، شرعی کہلانے کا مستحق ہے برخلاف روایتی مفہوم کے نیز کتاب یا مکاتبت میں جس چیز کو بطور شرط کے رکھا گیا ہے وہ غلاموں کی اہلیت وصلاحیت ہے اور یہ وہ شرط ہے جو فقہاء کی طرف سے نہیں بلکہ خود خدا کی طرف سے لگی ہوئی ہے۔ (ان علمتم فیھم خیرا ۔النور/۳۳) اور منصوص ہونے کے سبب اس کا انکار بھی ممکن نہیں ہے۔ کوئی ہے جو سوچے؟

واضح رہے کہ تحریر رقبة ، فكّ رقبة اور کتاب و مکاتبۃ بلاشبہ اپنے اثرات ونتائج میں ایک ہیں مگر دونوں کی نوعیّتوں میں بڑا فرق واقع ہو گیا ہے کیونکہ اول الذکر معاملہ خود آقاؤں کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے یعنی وہ (۱) اپنے غلاموں کو جب چاہیں بغیر کسی مالی معاوضہ کے آزاد کردیں (۲) یا پھر بطور کفارے کے انہیں آزاد کرنے کے پابند ہوں۔ ظاہر ہے کہ بصورت کفارہ

آزاد ہونے والے غلاموں سے کسی قسم کی مالی منفعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (۳)۔غلاموں کی حالت مظلومی پر ترس کھاتے ہوئے انہیں خرید کر آزاد کر دیں جیسا کہ سیدنا صدیق اکبرؓ نے ایسے متعدد غلاموں کو آزاد کرایا جن میں حضرت بلال حبشیؓ سرفہرست ہیں (صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب بلال رضی اللہ عنہ) اور اس شکل میں بھی غلاموں سے کچھ نہیں لیا جاتا نیز ایسے غلاموں کی صلاحیت واہلیت کا مسئلہ بھی بطور شرط کے کہیں بیان نہیں ہوا جبکہ مؤخر الذکر معاملہ (یعنی کتاب ومکاتبۃ) خود غلاموں کی جانب سے بطور درخواست یا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے۔اس لئے اس میں اہلیت کے مقدمہ کو بطور شرط کے رکھا گیا ہے نیز یہ شرط خود خدا کی طرف سے لگی ہوئی ہے یوں ان ہر دو غلاموں کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔

ج) راقم نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ اس کے بیان کردہ مفہوم کو قرآنی ماننے کی صورت میں انسداد غلامی کی کوئی نئی راہ کھل گئی ہے یہ تو صرف زاویہ نظر کو درست رکھنے کی بات ہے۔ناچیز کا دعویٰ صرف اتنا ہے کہ غلامی کا خاتمہ، قرآنی احکام کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہے۔اگر قرآن مجید فكّ رقبة، تحرير رقبة اور وفي الرقاب کے احکام نہ دیتا اور غلامی کے خاتمے کی تحریک کتاب ومکاتبت کی صورت میں نہ چلاتا تو شاید دنیا سے غلامی کا خاتمہ کبھی ممکن نہ ہوتا۔

د) فاضل تبصرہ نگار نے اپنے اس نکتے میں غلاموں اور جنگی قیدیوں کو ایک سمجھ کر تبصرہ کیا ہے۔حالانکہ یہ دونوں الگ الگ معاملات (Issues) ہیں۔کجا مکاتبت کے ذریعے حاصل ہونے والی آزادی اور کجا جنگی قیدیوں کی آزادی۔جس طرح مکاتبت کا قانون، قرآن مجید میں آیا ہے اسی طرح جنگی قیدیوں کی آزادی کا قانون بھی تو قرآن مجید میں الگ سے آیا ہے۔اس طرح یہ دونوں ہی ضابطے منصوص من اللہ ہوئے۔سورۂ محمد ۴؍ میں جو ضابطہ آیا ہے اس میں اولاً بطور احسان چھوڑنے اور ثانیاً زرفدیہ لے کر چھوڑنے کا حکم ہے۔پھر ظاہر ہے کہ جنگی قیدیوں کے ضمن میں یہ قانون خود، خدا کا بیان کردہ ہے اس لئے اسے نہ صرف قانون مکاتبت پر محمول کرنا غلط ہوگا بلکہ استحصالی سمجھنا بھی غلط ہوگا اور ویسے بھی یہ امر پیش نظر رہے کہ جنگی قیدیوں سے زر فدیہ لینا امر لازمی نہیں تھا بلکہ صواب دیدی اختیار کے تحت تھا اس لئے اس سے استحصالی مفہوم برآمد کرنا یا رواجی فقہ کے قانون مکاتبت کے مترادف سمجھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

قانون مکاتبت میں خدا نے غلاموں کی مالی امداد کا حکم دیا ہے نہ کہ ان سے وصولی کا (خواہ وہ دینے والے دیگر اہل خیر ہوں یا خود ان کے آقا) اس لیے غلاموں کو از روئے کتاب ومکاتبت پابند کرنا کہ وہ اپنے آقاؤں کو بصورت مال اپنی قیمت ادا کریں پھر آزادی حاصل کریں، کم از کم قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا۔

فاضل تبصرہ نگار کے دوسرے نکتے کے جواب میں راقم نے الگ سے تفصیلی مضمون لکھ دیا ہے اس لیے یہاں اس سے صرف نظر ہے۔ مضمون ملاحظہ فرمالیجئے گا۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

والسلام

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

کتابیات مزارات

۴۸- انگوری باغ،
رام پور ۲۴۴۹۰۱
۱۵/۱۱/۲۰۱۱ء

مکرمی! سلام مسنون

معارف مستقل مطالعہ میں رہتا ہے اور فکر ونظر میں توسّع اور بالیدگی پیدا کرتا ہے۔

ماہ اکتوبر ۲۰۱۱ء کے شمارہ میں محترم عارف نوشاہی صاحب کا مضمون ''کتابیات مزارات'' بہت ہی مفید مطلب تحریر ہے۔ البتہ اس میں میرے حوالہ سے ایک مقام پر غلط اندراج ہوگیا ہے۔ صفحہ ۲۶۵ پر اورنگ آباد (ہندوستان) کے ذیل میں آزاد بلگرامی کے معروف تذکرہ روضۃ الاولیاء کے اردو ترجمہ کا انتساب میری طرف کیا گیا ہے۔ دراصل روضۃ الاولیاء کے متن کی تصحیح، اردو ترجمہ اور مقدمہ سبھی امور علامہ نثار احمد فاروقی مرحوم نے انجام دیے ہیں۔ میں نے صرف حسن طباعت اور اشاعت کی ذمہ داریاں ادا کی ہیں۔ مزید اطلاع دے دوں کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی اشاعت کے لیے تیار ہے۔

خیر طلب

محمد شعائر اللہ خاں وجیہی

ادبیات

من زنده ام هنوز

پروفیسر محمد ولی الحق انصاری

شصت و سه سال پیش درین عالمِ وجود　　چشمم به روی دلبرِ شعر دری گشود
هشتاد و هفت سال زعمرم گذشت و لیک　　دامان فکر را نگسست است تار و پود
عشقِ سخن زبیشیِ عمرم نگشت کم　　با پیش رفتِ زندگیم ذوقِ آن فزود
تا این زمان به ملک سخن زنده مانده ام　　با آن که روزگار مساعد به من نبود
بی نور گشته دیده ولاکن عروسِ شعر　　پیش آورد به چشمِ دلم ، چهرهٔ سعود
وقتِ سخن طرازی به هنگام شب هنوز　　گوید دلم به شاهد معنی : ''بیای زود''
کافر نگشته ام ولی در معبد سخن　　سرخم کنم به پیش بتِ شعر چون هنود
قزاق وقت خواست که گیرد زارم ، ولی　　برجاست در خزینهٔ طبعم همه نقود
در سینهٔ من است ، دلِ من هنوز گرم　　طاری نشد هنوز به مغز سرم جمود
مغز خیال زا ، دهد اندیشه را فروغ　　آیینهٔ تصورِ من ، علمِ من زدود
چون خلوتِ تمام بود در سکوتِ شب　　ناظوره کلام کند پیشِ من نمود
الآن هم چو دورهٔ پیشین عروس شعر　　پیش آیدم زغیب به جلوه گهِ شهود
در چشم نغمه نیست خمارِ شرابِ خواب　　دارم هنوز بادهٔ فن ، در خُم وجود
گو ساله سازنی به تفکر چو سامری　　گم گشته نی به تیهِ خیالات چوں یهود
هستم چو محو جذبهٔ گفتار ، می شوم　　بیخود چو زاهدی به عبادت ، دم سجود
فکر نه قطره ای که چکد بر زمین ، ز ابر　　بالا رود عقاب خیالم ، مثالِ دود

۲۷-فرنگی محل، لکھنؤ-۲۲۶۰۰۳-

طرزِ ادا قشنگ ، ہم الفاظ دل نشین　　تخییلِ من بلند ، بہ طوری کہ پیش بود
شہبازِ فکر من ، مہہ و انجم شکار چی　　اندیشہ ام چنانکہ نہ محدود ، در حدود
این وقت ہم دبیرِ قلم می کند رقم　　آزاد گشتہ از مہہ پابندی و قیود
ہر لفظ نگارشِ من ، خوب ، چوں گہر　　نکہت فروش ، نافۂ شعراست ، مثل عود
اردو ، نہ تنہا مایۂ شعراست ، چون اسدؔ　　فکرم بہ قصرِ شعرِ دری ، ہم دری گشود
مستغنی ام ز مدح و ذمِ اہل روزگار　　بالا از این ہمہ ، مرا آزادگی ربود
نی بیم ننگ ، نی غم بی اعتناییم　　نی آرزوی شہرہ و نی خواہش نمود
نی شادم از ستایشِ خویشان و دوستان　　غمگین نیم زطنز بد اندیش وہم حسود
آزردہ ام نہ از سخنِ تلخِ ناکسان　　نی خوش ، متاعِ نظم را ، نا اہل گرستود
پیوستہ تا کنون دلِ من ہست صیدِ غم　　تاثیرِ شعر از خلشِ نیش آن فزود
دارم دل از غمِ کسی چو لالہ داغدار　　چشمم ، چونم ز آب ، شدہ نرگس کبود
چون روزگار تو بہ سرآمد ، ولی ، کنون　　زین بانگِ برتری وتعلّی تراچہ سود
لطف و کرم ز جانبِ پروردگار خواہ　　بفرست پیشِ ختم رسولؐ تحفہ درود

در پیروئ میرِ عرب ، راہِ حق بجوی
جویای مغفرت بشو ، از ، داورِ ودود

یاد علامہ سہیل

الحاج ابومعاذ محمد مزمل عباسی دانشؔ چریا کوٹی☆

بعد از حادثۂ ارتحال جناب مولانا اقبال احمد سہیل مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۵۵ء

بتا اے شامِ غم بیتاب پروانے پہ کیا گذری　　کسی شعلہ بجاں کے جل کے بجھ جانے پہ کیا گذری
حضورِ حسن نقد جان کے نذرانے پہ کیا گذری　　محبت جاں بحق تسلیم ہوجانے پہ کیا گذری
عجب وحشت کا عالم ہے اسیران محبت پر　　کہ چھٹ کر بند سے صحرا میں دیوانے پہ کیا گذری

مبارک ہو سفر او جانے والے بزم ہستی سے خبر بھی ہے تجھے آباد کاشانے پہ کیا گذری

عروس آرائے اردو بت تراش پارسی رخصت پری خانے پہ کیا گذری صنم خانے پہ کیا گذری

تہِ ابر کرم آیا ثنا خواں تیرے ساقی کا سنا اے موجِ کوثر کہنے کہلانے پہ کیا گذری

جہان ہوش میں اک شورِ حشر انگیز برپا ہے نہ جانے اس جنوں آموز دیوانے پہ کیا گذری

ترا ایمان حبِ اہل بیت و حبِ پیغمبر بہ ایں اسباب آمرزش چلے جانے پہ کیا گذری

ترے اعمال حسنہ نعت گوئی حبِ انسانی بہ ایں سرمایہ منزل سامنے آنے پہ کیا گذری

امانت تھی تری اے خاک صحرا سونپ دی ہم نے پتہ دے خاک میں گوہر کے مل جانے پہ کیا گذری

سپرد خاک کر کے ہاتھ دھو بیٹھے ترے ہمدم کسے اس کی خبر ذی ہوش دیوانے پہ کیا گذری

ترا احساں کہ تو رونق دہِ گورِ غریباں ہے مگر آغوش شبلؔی میں نہ جا پانے پہ کیا گذری

سہیؔل اک نور تھا دانشؔ مگر دنیا نے کیا جانا

کوئی موسیٰ سے پوچھے طور جل جانے پہ کیا گذری

☆ جناب دانش ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۸۷ء میں اعظم گڈھ میں ان کا انتقال ہوا، ان کا یہ غیر مطبوعہ کلام جناب عبدالرحمٰن قمر عباسی نے نذر معارف کیا، فجزاہ اللہ۔

مطبوعات جدیدہ

ترجمہ روضۃ الاولیاء بیجاپور : از حضرت محمد ابراہیم بیجاپوری، مترجم جناب سید شاہ سیف اللہ قادری، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۹۲، قیمت درج نہیں، پتہ : حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، پانکور ناکا (PANKORNAKA) احمد آباد، گجرات اور سید شاہ میران محمد سجادہ نشین آستانہ صبغۃ اللہی، ارکاٹ درگاہ، نزد جامع مسجد بیجاپور کرناٹک۔

برصغیر میں اسلام کی آمد اور مسلمانوں کی حکومت کے قیام کی تاریخ میں ایک اہم باب حضرات صوفیہ کے وجود اور ان کی دینی، اخلاقی اور انسانی تعلیم و تربیت کے متعلق جدوجہد کا ہے، مورخین نے تاریخ کے اس پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جس کی وجہ سے ان حضرات کے سوانح اور خدمات کے مرقعے تیار ہوتے رہے، ان میں جہاں تذکرۃ الاولیاء، سیر الاولیاء، گلزار ابرار اور اخبار الاخیار جیسی جامع کتابیں تھیں وہیں مختلف علاقوں اور خطوں کے اولیاء کے حالات بھی مرتب ہوتے رہے، تاریخ اولیائے دکن، تاریخ اولیائے برہان پور، تاریخ صوفیائے لاہور وغیرہ معروف تذکرے ہیں، زیرنظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں دکن کی مشہور مسلم ریاست بیجاپور کے قریب ڈیڑھ سو بزرگوں کے احوال قلم بند کیے گئے ہیں، مولف نے ۱۲۴۰ھ میں لامع النور کے نام سے مختلف فارسی تذکروں کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی تھی، لیکن جلد ہی یہ نایاب اور مترجم کے الفاظ میں عدیم الوجود ہوگئی، تلاش بسیار کے بعد جب یہ ملی تو مناسب سمجھا گیا کہ اس کو اردو قالب میں پیش کیا جائے تا کہ استفادہ عام اور آسان ہوسکے، ۱۳۱۴ھ میں یہ کام کچھ اضافوں کے ساتھ انجام پایا، مرور زمانہ کے ساتھ یہ اردو ترجمہ بھی گویا مفقود ہوگیا جس کو اب حضرت پیر محمد شاہ لائبریری نے جوں کا توں شائع کر کے دکن میں اسلامی سطوت و عظمت کی ایک داستان پارینہ کو زندہ کردیا، سینکڑوں بزرگوں اور چند نیک بی بیوں کے ذکر پر مشتمل یہ تذکرہ حضرات اولیاء کے دیگر قدیم تذکروں ہی کے طرز پر ہے، کرامات کی کثرت ہے، پہلا بیان بیجاپور میں موجود موئے مبارک کے متعلق ہے اور عجیب و غریب واقعات پر مشتمل ہے، کتاب کا آغاز حضرت حاجی رومی کے تذکرہ سے ہوا اور ان کی یہ کرامت تفصیل سے بیان کی گئی کہ کس طرح انہوں نے ایک مذبوحہ

گائے کو صرف کھال اور سینگ کی مدد سے زندہ کر دیا، لیکن اس قسم کی روایتوں سے قطع نظر یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ ان حضرات نے علاقہ دکن میں سیف و سناں سے بھی تعلق رکھا اور جہاد و قتال کا فریضہ انجام دیا، ساتھ ہی دلوں کے آئینہ سے ظلمت و صداقت کا زنگ دور کیا، بہتر ہوتا کہ ڈیڑھ سو سال پہلے کی کتابت کے عکس کی جگہ موجودہ کتابت اور ترتیب و حواشی سے یہ نسخہ مزین ہوتا تا کہ آج کے قاری کے لیے اس کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی۔

پروفیسر عبدالعلیم شخص، ادیب اور عالم: از جناب ریاض الرحمٰن شروانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۳۲، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، یوپی۔

مسلم یونیورسٹی کی تاریخ اور اسی حوالے سے گذشتہ صدی کی مسلم تاریخ میں ایک نمایاں نام پروفیسر عبدالعلیم کا ہے، کتاب عقیدہ اعجاز القرآن کے مصنف اور اردو میں ترقی پسند تحریک کے موید کی حیثیت سے ان کی علمی وادبی جہات کا تعین کیا جاتا ہے، لیکن ان کی اصل شخصیت کے مطالعہ کے لیے علیگڑھ کی کتاب زندگی ناگزیر ہے، یہی رنگ ان کی شخصیت کی شناخت ہے، غالباً اسی لیے ۲۰۰۹ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے جب ان کی صد سالہ تقریبات ولادت کی مناسبت سے ایک روزہ سمینار کا اہتمام کیا تو گفتگو کا غالب تر حصہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر چھایا رہا، شرکائے مذاکرہ نے ان کی شرافت، وسیع النظری، بے تعصبی، اعلیٰ ظرفی، کم سخنی اور وقت کی پابندی جیسے اوصاف وخصائل کا بالعموم ذکر کیا، فاضل مرتب نے تحیر، معصومیت اور خوش مزاجی کی مزید خوبیوں کے ذکر میں یہ بھی لکھا کہ طبعی شرافت نفس کی وجہ سے ان کی بذلہ سنجی بہرحال دل آزار نہیں ہوتی تھی، بعض اہل قلم نے دبے الفاظ میں ان احساسات کے ساتھ ان پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ مناسب سمجھا جو بشریت کے تقاضوں کے منافی نہیں، علیم صاحب کے نامہ اعمال میں ان کے مذہب کے خانہ پر عموماً نظر رہی اس سلسلہ میں ان کی صاحبزادی کی یہ گواہی کافی ہے کہ "قرآن کے نقطہ نظر سے ایک مسلمان کی جو تشریح ہے وہ اس پر ہمیشہ دیانت داری سے قائم رہے، مذہبی امور میں دخل اندازی کی بات تو دور ہے انہوں نے ان میں ہمیشہ رہنمائی کی"، علی گڑھ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ان مضامین میں لطف ولذت اور کہیں کہیں حیرت وعبرت کا سامان ہے، حواشی اور توضیحات کی ضرورت کو فاضل مرتب کے پیش لفظ نے نہایت عمدگی اور خوش سلیقگی سے پورا کر دیا۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصرے: ترتیب و تدوین جناب محمد عارف اقبال، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۶۴، قیمت ۲۲۰ روپے، پتہ: اردو بک ریویو ۳/۱۷۳۹، بیسمنٹ، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

کتابوں سے محبت، مطالعہ کی کثرت اور تجزیہ کی غیر معمولی مہارت کی صفت کم ہی ودیعت ہوتی ہے، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی شخصیت میں سیاسیات کے علم و تدریس اور تصنیف و تالیف کے علاوہ عملی سیاست کے عناصر شامل رہے، یعنی وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے نامور معلم کے علاوہ کانگریس پارٹی کے نظریات سے استواری اور راجیہ سبھا کی ممبری کی وجہ سے معروف رہے، علم سیاسیات میں ان کی کتابیں ان کی انفرادیت بیان کرتی رہیں، لیکن ان کے یہ مشاغل کتاب خوانی اور کتاب شناسی سے ان کے گہرے اور مضبوط رشتے میں کبھی حائل نہ ہوئے، انہوں نے شروع میں انگریزی کتابوں پر تبصرے لکھے، پھر اپنے عم محترم مولانا عبدالماجد دریابادی کے صدق میں مولانائے مرحوم کے ان مشوروں کے مطابق اردو کتابوں پر تبصرہ کرنا شروع کیا کہ اول تو کتاب کو بالاستیعاب پڑھا جائے، مصنف کی تحقیق اور محنت کی داد دی جائے، قابل تعریف حصوں کی جانب اشارہ کیا جائے ساتھ ہی واقعات کے تعلق سے غلط بیانی کی تصحیح بھی کی جائے اور اگر مذہب و اخلاق پر قلم حملہ آور ہوا ہے تو سر بھی قلم کیا جائے، زبان کی صحت پر دھیان رہے اور اظہار واقعہ میں ذاتیات کو قطعی دخل نہ دیا جائے، اردو کے ایک عظیم مبصر کی ان ہدایات کی روشنی میں ڈاکٹر قدوائی نے جس طرح تبصروں کی دنیا طے کی وہ کم از کم اس مجموعہ مضامین سے خوب عیاں ہے اور روشن بھی، سوانح، تاریخ، تذکرہ، تحقیق و تنقید، لسانیات، شعر و ادب، سفر نامہ، مکتوبات، تعلیم، سماجیات اور اسلامیات جیسے موضوعات پر قریب ۷۶ کتابوں اور رسائل پر ان کا یہ مجموعہ ان تبصروں پر مشتمل ہے جو صرف موقر رسالہ اردو بک ریویو میں شائع ہوئے، مرتب کتاب نے بالکل صحیح لکھا کہ ڈاکٹر صاحب ہر تازہ کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے اس کے حسن و قبح پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں، مداہنت سے انہوں نے کبھی کام نہیں لیا، ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی حمیت اسلامی ہے، پروفیسر شیث محمد اسماعیل اعظمی کے اس خیال سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں کہ تجدد، روشن خیالی اور سیکولرزم جیسے الفاظ ان کی دینی حمیت کو کبھی زیر نہیں کر سکے، یہی نہیں کتاب کی روح کو سامنے لانے اور اس کے عطر کو کشید کرنے میں یہ تبصرے دوسروں کے لیے ایک مثال اور لائق تقلید مثال ہیں۔ ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- **اردو ادب کے اولین نقاد مولانا باقر آگاہ دہلوی**، علیم صبا نویدی، تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چنائی-۲، قیمت ۴۰۰ روپے۔

۲- ثقافة عن الهند ، **جلد اول**، پروفیسر حسان خاں، مکتبہ دین و دانش، ۱۳/شارع مسجد شکور خاں، بھوپال، قیمت ۲۰۰ روپے۔

۳- دراسات تاريخية ، پروفيسور محمد سليمان اشرف ، كوخ العلم ، ۹٤ ، مشقق ساكشارا ، باشا فيها / ۳، بلوك ، دلهی ، **قیمت درج نہیں**۔

۴- نفحات من الادب الاسلامی ، محمد طارق الايوبی الندوی ، ايجوكيشنل بك هاؤس ، سوق شمشاد علی كره ، **قیمت ۹۰ روپے**۔

۵- حالی والادب العربی ، پروفيسور محمد سليمان اشرف ، كوخ العلم ، ۹٤ ، مشقق ساكشارا ، باشا فيها / ۳، بلوك ، دلهی ، **قیمت درج نہیں**۔

۶- سيد احمد خان حيات و افكاره ، محمد صلاح الدين العمری ، جامعه علی كره الاسلاميه ، علی كره ، **قیمت ۱۰۰ روپے**۔

۷- كتاب الرايات لسلاسل الصوفيه ، شیخ عبداللطیف، تخریج قاضی صلاح الدین محمد ایوب مع مقدمہ محمد حمید اللہ، عذرا پرنٹرس ۳۲۶، تربلیکین ہائی روڈ، چنئی-۵، قیمت درج نہیں۔

۸- كتاب المقطوع والموصول ، امام ابو بكر محمد بن القاسم بن محمد بن بشار الانباری البغدادی ، تحقیق استاذ امتیاز علی خاں عرشی، مقدمہ پروفیسر شاہ عبدالسلام، مکتبہ رضا رام پور، الہند، **قیمت ۲۰۰ روپے**۔

۹- فصول فی التعريف بالهند العربية الاسلاميه ، سيد عليم اشرف الجائسی ، دارالعلوم ، جائس ، رائے بريلی يوبی الهند ، **قیمت ۲۰۰ روپے**۔

۱۰- الامامة فی الصلوٰة ، مسائلها واحكامها ، محمد مسعود العزيزی الندوی ، دار البحوث والنشر ، مركز احياء الفكر الاسلامی ، مظفر آباد ، سهارن فور ، الهند ، **قیمت درج نہیں**۔